دِل کی دُنیا

تصوّف کے صحیح تعارف اور اُس کے بُنیادی مسائل پر مشتمل دلنشین مضامین کا مجمُوعہ، جن سے یہ بات بے غُبار ہو کر سامنے آتی ہے کہ درحقیقت تصوّف بھی دین ہی کا ایک شُعبہ ہے جو تمام تر قرآن و سُنت ہی سے ماخوذ اور انہی کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

حضرت مولانا مُفتی مُحمّد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مُفتیٔ اعظم پاکستان

مکتبۂ معارف القرآن کراچی ۱۴

باہتمام : محمد مشتاق قاسمی

طبع جدید : محرم الحرام ۱۴۳۲ھ - دسمبر ۲۰۱۰ء

مطبع : احمد برادرز پرنٹرز، کراچی۔

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : 92-21-35031565, 35123130

ای میل : info@quranicpublish...s.com
mm.q@live.com

ویب سائٹ :
ONLINE SHARIAH
www.SHARIAH.com
آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے
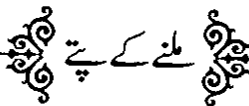
- مکتبہ دارالعلوم، کراچی
- ادارۃ المعارف، کراچی
- دارالاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- ادارہ اسلامیات، کراچی/ لاہور
- بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدرآباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم

وعلى آله وأصحابه أجمعين.

أما بعد!

رمضان کی بات ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے بعض حضرات نے اصرار کیا کہ نماز فجر کے بعد "تصوف" کے تعارف اور اس کے بنیادی مسائل پر خطاب فرمائیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ درخواست منظور فرمائی اور روزانہ فجر کے بعد کبھی پندرہ منٹ، کبھی آدھا گھنٹہ اور کبھی اس سے کچھ زیادہ دیر تک یہ بیان شروع ہو گیا۔ یہ بیان اتنا دلکش، اتنا دلنشین اور اتنا مفید ثابت ہوا کہ اس کے سامعین آج تک اس کے کیف و سرور کو یاد کرتے ہیں۔

"تصوف" کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، کوئی اسے قرآن و سنت کی تعلیمات سے الگ کوئی چیز سمجھ کر اسے بدعت قرار دیتا ہے، کوئی شریعت کو اس کا حریف سمجھ کر صرف تصوف ہی کو مدار نجات قرار دیتا ہے اور شرعی احکام کو اس کے مقابلے میں کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں...... حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان بیانات نے تصوف کی اصل حقیقت اتنے دلنشین انداز میں بیان فرمائی کہ افراط و تفریط کے ان خیالات کا قلع قمع ہو گیا، اور یہ بات بے غبار ہو کر سامنے آگئی کہ در حقیقت تصوف بھی دین ہی کا ایک شعبہ ہے جو تمامتر قرآن و سنت ہی سے مأخوذ اور انہی کی تعلیمات

کا نچوڑ ہے۔

ان بیانات کو اس وقت ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ بھی کیا گیا، اور بعد میں راقم الحروف نے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے انہیں قلمبند بھی کرنا شروع کیا اور جب ماہنامہ "البلاغ" میری ادارت میں نکلنا شروع ہوا تو میں ہر ماہ ان بیانات کا کچھ حصہ قلمبند کر کے "دل کی دنیا" کے مستقل عنوان کے تحت شائع کرتا رہا۔ قلمی شکل میں یہ بیانات حضرت والد صاحب قدس سرہ کی نظر سے بھی گذرے، اور انہوں نے بعض مقامات پر ترمیم و اضافہ بھی فرمایا۔

افسوس ہے کہ میں یہ سلسلہ زیادہ عرصے جاری نہیں رکھ سکا اور بعد میں وہ ٹیپ بھی محفوظ نہ رہے جن کی مدد سے میں انہیں قلمبند کرتا تھا، لہذا اس بات کا انتظار رہا کہ کسی وقت حضرت والد صاحب قدس سرہ ہی بہ نفس نفیس ان کی تکمیل فرمائیں گے۔ لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی مصروفیات اور علالت کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا۔ یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ "انا لله وإنا إليه راجعون"

اب ادارۃ المعارف کراچی نے ان مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے، اگرچہ ان بیانات کے بہت سے عنوانات ابھی ضبط تحریر میں نہیں آسکے، لیکن جتنے مضامین اس مجموعے میں آئے ہیں وہ بھی بذات خود بہت مفید ہیں، اور کم از کم ان سے تصوف کا صحیح تعارف اور اسکے بنیادی خدوخال ضرور سامنے آجاتے ہیں۔

نیز ان کے مطالعے سے اپنی اصلاح کی فکر بیدار ہوتی ہے۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالی اس مجموعے کو امت کے لئے مفید بنائیں اور ہم سب کو اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین!

احقر
محمد تقی عثمانی
دار العلوم کراچی

۱۹ / ذیقعدہ ۱۴۱۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم تصوف اور اس کا موضوع

,,سیپارہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست،،

ہم اور آپ انسان ہیں، ہمیں اپنے انسان ہونے پر فخر بھی ہے، لیکن کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ ''انسان'' کہتے کسے ہیں؟ کیا انسان اس گوشت پوست، ان ہاتھ پاؤں، ناک کان، اور اس ظاہری ڈھانچے کا نام ہے؟ کیا انسان کا لفظ صرف ہمارے ظاہری جسم اور اعضاء و جوارح کے لئے وضع ہوا ہے؟، آپ غور کریں گے تو ان سوالات کا جواب آپ کو نفی میں ملے گا، اس لئے کہ واقعات اس کی تردید کرتے ہیں، اس بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے ایک مثال پر غور کیجئے:

زید ایک انسان ہے، اپنی زندگی میں وہ اپنے مال و دولت اور زمین و جائیداد کا مالک ہے، اپنی بیوی کا شوہر ہے، اپنے دفتر کا افسر ہے، اپنے ماتحتوں پر اس کا حکم چلتا ہے، اس کے چھوٹے اس سے ڈرتے ہیں، جب تک اس کے سینہ میں آخری سانس باقی ہے اس وقت تک کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کا مال لے اڑے، یا اس کی جائیداد پر قبضہ کر بیٹھے، یا اس کی بیوی کو اپنی بیوی بنالے، اگر کوئی ایسا کرے گا تو قانون اس کی پشت پناہی کے لئے موجود ہے، قانوناً وہ شخص سزا کا مستحق ہوگا۔

لیکن جہاں آخری سانس اس کے منہ سے نکلا تو نہ وہ مال ودولت کا مالک رہا، نہ زمین وجائیداد کا، نہ بیوی اس کی رہی، نہ اسکے ماتحت، اس کی لاش صحیح سالم ابھی گھر میں موجود ہے، لیکن اس کی تمام دولت کسی اور کی ہو چکی ہے، جو مکان اس نے اپنے لئے تعمیر کیا تھا اب غیروں کی ملکیت ہے، جن نوکروں پر وہ حکم چلاتا تھا اب وہ کسی اور کے چشم وابرو کو دیکھتے ہیں۔

اگر انسان اس گوشت پوست اور ظاہری ڈھانچہ کا نام تھا تو سوال یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا انقلاب کیسے رونما ہو گیا۔ اس کا جسم وہی جسم ہے، اس پر وہی گوشت پوست اب بھی موجود ہے، اس میں ہاتھ پاؤں اور ناک کان اسی طرح لگے ہوئے ہیں، لیکن اب اس کو کوئی انسان کیوں نہیں کہتا؟ اب اسے انسانی حقوق کیوں حاصل نہیں؟

معلوم ہوا کہ ,,زید،، صرف گوشت پوست اور ظاہری ڈھانچہ کا نام نہیں تھا، سوال یہ ہے کہ وہ پھر کس چیز کا نام تھا؟ آیئے دیکھیں کہ "زید" کی لاش میں وہ کونسی چیز ختم ہو گئی ہے جس کی بناء پر اب اسے انسان نہیں کہا جاتا؟...... ذرا سا غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ "زید" کی لاش میں اور تمام چیزیں موجود ہیں، صرف ایک چیز کی کمی ہے، اور وہ ہے "روح" اسی روح کی کمی سے اب زید وہ زید نہیں رہا جو کبھی کوٹھی بنگلوں کا مالک تھا، اور جس کا اس کے ماتحتوں پر حکم چلا کرتا تھا۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ انسان صرف گوشت پوست اور جسم کا نام نہیں ہے، بلکہ جسم اور روح کے مجموعہ کا نام ہے، جب تک روح کا تعلق جسم کے ساتھ قائم رہتا ہے اس وقت تک انسان، انسان کہلاتا ہے، اور جب روح جسم کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے تو پھر وہ ایک بے جان لاش بن جاتا ہے، انسان نہیں رہتا۔

اسی بات کو دوسرے پیرایہ میں یوں کہہ لیجئے کہ انسان میں دو قسم کے جہاں پائے جاتے ہیں، ایک جسم اور مادہ کا جہاں، جسے ہم آنکھوں سے دیکھ کر اور ہاتھوں سے چھو کر محسوس کر لیتے ہیں، اور اس جہاں کے ساتھ ایک باطنی جہاں اور ہے، جسے ہم نہ دیکھ سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں۔ اسی باطنی دنیا میں "روح آباد ہے" اسی پوشیدہ دنیا میں دل دھڑکتا ہے، اسی

میں خواہشیں جنم لیتی ہیں، اسی میں امنگیں اور آرزوئیں پروان چڑھتی ہیں، اسی میں سرور اور غم، نفرت اور محبت، ایثار اور بغض جیسے جذبات پرورش پاتے ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہی پوشیدہ دنیا جسے ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، انسان کی اصل دنیا ہے، جب تک اس دنیا کا نظام چلتا رہتا ہے اس وقت تک انسان زندہ رہتا ہے اور اسے معاشرے میں تمام انسانی حقوق حاصل ہوتے ہیں، لیکن جہاں یہ نظام بند ہو جاتا ہے وہیں انسان مردہ کہلانے لگتا ہے، اور اس کے تمام حقوق سلب ہو جاتے ہیں۔

پھر جس طرح انسان کا ظاہری جسم کبھی تندرست ہوتا ہے اور کبھی اسے بیماریاں لگ جاتی ہیں، اسی طرح روح بھی کبھی صحت مند ہوتی ہے اور کبھی بیمار ہو جاتی ہے جس طرح زکام، نزلہ، بخار اور مختلف قسم کے درد جسم کی بیماریاں ہیں، اسی طرح غم و غصہ، خود غرضی، تکبر، ریاء اور خود پسندی روح اور دل کی بیماریاں ہیں۔

اسلام چونکہ زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام ہے، اس لئے اس نے انسان کی ان دو حیثیتوں کو نظر انداز نہیں کیا، اس نے جہاں ہمارے ظاہری جسم کے متعلق ہمیں کچھ ہدایات دی ہیں، وہاں ہمارے دل کی پوشیدہ دنیا سے متعلق بھی ہمیں کچھ احکام بتلائے ہیں، جس طرح ہماری ظاہری زندگی میں وہ ہمیں نماز، روزہ، حج اور زکوۃ جیسے بہترین اعمال کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے، اور کچھ برے کاموں سے روکتا ہے، اسی طرح ہماری باطنی زندگی میں اپنے آپ کو کچھ بہترین صفات سے آراستہ کرنے کا حکم دیتا ہے، اور کچھ رذیل صفات سے پاک کرنے کا۔

اسلام کے جو احکام ہماری **ظاہری زندگی** سے متعلق ہیں وہ علم فقہ کا موضوع ہیں، اور جو احکام ہمارے باطن کی پوشیدہ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں وہ علم تصوف میں بیان کئے جاتے ہیں۔

لہذا علم تصوف کا موضوع ہمارے دل کی وہ دنیا ہے جو ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آتی، مگر اس کا ہماری زندگی سے نہایت گہرا تعلق ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دل کیا

ہے ؟ طبیبوں اور ڈاکٹروں سے پوچھئے تو وہ اس کا جواب یہ دیں گے کہ دل گوشت کا ایک لو تھڑا ہے، جو انسان کے سینہ میں بائیں جانب لٹکا ہوا ہے، اور اس کے جوف میں سیاہ قسم کا جما ہوا خون ہوتا ہے، جو سویداء قلب کہلاتا ہے، اور جب یہ لو تھڑا خون کو پمپ کر کے باہر کی طرف پھینکتا ہے تو اس کو دل کی دھڑکن سے تعبیر کرتے ہیں، اسی طرح روح اطباء کے نزدیک اس بھاپ اور اسٹیم کا نام ہے جو قلب کے اندر خون سے پیدا ہوتی ہے، اور شریانوں کے ذریعہ سارے بدن میں پہنچ جاتی ہے۔

لیکن تصوف میں جس چیز کو دل اور روح کہا جاتا ہے وہ اس ظاہری روح اور دل سے کسی قدر مختلف ہے تصوف کی اصطلاح میں "دل" اور "روح" دو لطیف قوتیں ہیں جو انسان کے خالق نے اس ظاہری قلب وروح کے ساتھ پیدا کی ہیں، جس طرح آنکھ دیکھنے کی، کان سننے کی اور ہاتھ چھونے کی طاقت رکھتے ہیں، اسی طرح خون کا یہ لو تھڑا جسے "دل" کہتے ہیں خواہشیں کرنے کی طاقت رکھتا ہے، تصوف کی اصطلاح میں دل اسی طاقت کا نام ہے جو انسان میں مختلف خواہشیں اور جذبات پیدا کرتی ہے۔

دل اور روح کی یہ لطیف اور پوشیدہ قوتیں ہمارے ظاہری قلب کے ساتھ کیا جوڑ رکھتی ہیں ؟ ان دونوں میں باہم کیسا ربط ہے ؟ اس کی حقیقت ہم نہیں جانتے، ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اِن دونوں میں باہم گہرا ربط ہے، کس طرح ہے ؟ یہ صرف خدا جانتا ہے، جس نے یہ جوڑ پیدا کیا ہے، جس طرح ہمیں یہ معلوم نہیں کہ مقناطیس اور لوہے میں کیا ربط ہے ؟ مقناطیس روئی اور کاغذ کو کیوں نہیں کھینچتا ؟ اسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ قلب وروح کی یہ پوشیدہ قوتیں خون کے اس لو تھڑے سے کیا جوڑ رکھتی ہیں ؟ اسی لئے جب مشرکین نے روح کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تو اس کے جواب میں یہی کہا گیا کہ

"قُلِ الروح مِن امرِ ربی"

"یعنی روح ایک امر ربّی ہے، جس کی حقیقت تم نہیں جان سکتے۔"

تصوف ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ دل کی یہ پوشیدہ دنیا انسان کی ظاہری دنیا کی بنیاد ہے، اور

اسی پر انسان کا بناؤ اور بگاڑ موقوف ہے، اگر دل کی یہ دنیا صحیح ہے، اس کا نظام ٹھیک چل رہا ہے، اس میں صحیح خواہشیں پیدا ہوتی ہیں۔ صحیح جذبات جنم لیتے ہیں، تو انسان صحت مند ہے اور اگر اس کا نظام گڑبڑ ہے تو انسان کی ظاہری زندگی کا نظام بھی گڑبڑ ہو جاتا ہے، سرکار دوعالم ﷺ نے اسی حقیقت کو آج سے تیرہ سو سال پہلے اس طرح بیان فرمایا تھا:

,,ألا إن فى الجسد لمضغة إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهى القلب،،

”یعنی خبردار! جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست رہے تو پورا جسم درست رہتا ہے، اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔“

دل کے سنورنے اور بگڑنے کا کیا مطلب ہے؟ وہ کن چیزوں سے سنورتا اور کن چیزوں سے بگڑتا ہے؟ اس کی بیماریاں کیا ہیں؟ اور ان کا علاج کیسے کیا جاسکتا ہے؟ بس یہی باتیں علم تصوف کا موضوع ہیں، اور انہی باتوں کو قدرے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ میں آئندہ نشستوں میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

امراض باطنہ کے علاج کی اہمیت

"علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا"

پچھلی مجلس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ انسان صرف اس کے ظاہری ڈھانچے کا نام نہیں، بلکہ اس کا اصلی جوہر اس کا باطن ہے، جس کو قلب اور روح وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر صحیح بخاری کی حدیث سے یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ انسان کے ظاہری اعمال کی صحت وفساد اور بناؤ اور بگاڑ بھی اس کے باطن کے بناؤ و بگاڑ پر موقوف ہے۔

آج کی مجلس میں یہ بتلانا ہے کہ جس طرح ظاہر بدن کبھی تندرست ہوتا ہے کبھی بیمار، اور تندرستی قائم رکھنے کے لئے غذا ہوا وغیرہ سے تدبیر کی جاتی ہے، بیماریوں کو دفع کرنے کے لئے دواؤں سے علاج کیا جاتا ہے، اسی طرح انسان کے باطن کی تندرستی کی تدبیر اپنے خالق ومالک کو پہچاننا اس کا ذکر و شکر اور اس کے احکام کی اطاعت ہمہ وقت کرنا ہے، اس کی بیماری اللہ کی یاد سے غفلت اس کے احکام کی خلاف ورزی ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے :

"فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللهُ مَرَضًا"

ان کے دلوں میں (کفر و نافرمانی کی) بیماری ہے سو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھادی۔

یہ دل کی بیماریاں، کفر، شرک، نفاق، حسد، کینہ، تکبر، نخوت، حرص، بخل، حب جاہ، حب مال، غرور وغیرہ ہیں، اور تندرستی یہ ہے کہ اپنے مالک حقیقی حق تعالیٰ کو پہچانے تمام نفع نقصان، تکلیف راحت کا مالک اس کو سمجھے، اسکی نعمتوں کا شکر ادا کرے، کوئی تکلیف پیش آئے تو صبر سے کام لے، تمام معاملات میں اللہ پر بھروسہ کرے، اس کی رحمت کا امیدوار اور عذاب سے ڈرتا رہے، اسکی رضا جوئی کی فکر میں رہے، اور صدق واخلاص کے ساتھ تمام احکام بجالائے۔

ان باطنی امراض سے نجات حاصل کرنے کا مکمل علاج قرآن کریم ہے :

"وَنُنَزِّلُ مِنَ القُرآنِ مَاهُوَ شِفَاء وَّ رَحمَةٌ لِلمُؤمِنِينَ"

ہم نازل کرتے ہیں قرآن سے وہ چیز جو شفاء اور رحمت ہے مومنین کے لئے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

"قُل هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَّشِفَاء"

یعنی آپ (ﷺ) کہہ دیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے ہدایت ہے، اور شفاء۔

لیکن باطنی بیماریوں اور ان کے علاج میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ظاہری بیماریاں تو آنکھوں اور دوسرے حواس سے محسوس کی جاسکتی ہیں، نبض کی حرکت، خون اور فضلات کا امتحان کر کے معلوم کی جاسکتی ہیں، ان کے معالجات بھی محسوس آلات اور دواؤں سے کئے جاتے ہیں، باطنی امراض نہ آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں، نہ نبض وغیرہ سے ان کو پہچانا جاسکتا ہے، اسی طرح ان کا علاج بھی محسوس غذاؤں اور دواؤں سے نہیں ہوتا، ان امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز صرف قرآن وسنت کے بتلائے ہوئے اصول ہی سے ہو سکتی ہے۔

قرآن وسنت میں انسان کے ظاہری اعمال اور معاملات اور باطنی عقائد اور اخلاق سب ہی کی اصلاح کا مکمل نظام موجود ہے۔

امت میں صحابہ وتابعین سے لے کر موجودہ زمانے کے صالحین کاملین تک جس کو جو کچھ کمال حاصل ہوا ہے وہ صرف اسی نظام عمل کی مکمل پابندی سے ہوا ہے، وہ جس طرح نماز، روزے، حج، زکوۃ کے پابند تھے، اسی طرح صدق، اخلاص، توحید، تواضع، صبر، شکر، توکل، زہد وغیرہ باطنی اعمال میں بھی ویسا ہی کمال رکھتے تھے، وہ جس طرح، جھوٹ، فریب، چوری، بے حیائی وغیرہ گناہوں سے ڈرتے بچتے تھے، ٹھیک اسی طرح کبر ونخوت، دوسروں کی تحقیر وتوہین، حب جاہ، حب مال، حرص، بخل وغیرہ باطنی گناہوں کو بھی ایسا ہی حرام جانتے، اور ان سے پرہیز کا اہتمام کرتے تھے۔

علماء امت نے عوام کی سہولت کے لئے قرآن وسنت کے اس پورے نظام کو چند علوم وفنون میں الگ الگ جمع کر کے مدون کر دیا، اعمال ظاہرہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اور نکاح

وطلاق اور تمام معاملات کو علم فقہ میں اور اعمال باطنہ میں سے عقائد کو علم عقائد میں، اور اخلاق و معاشرت کو علم تصوف میں جمع کر دیا۔

بعض حضرات علماء نے تینوں علوم کو یکجا بھی لکھا ہے، علامہ ابن السبکی نے اپنی کتاب "جامع الجوامع" میں جو اصول فقہ کی مشہور کتاب ہے، اس کے آخر میں بعنوان "خاتمہ" تصوف واخلاق اور اعمال باطنہ کی بھی کچھ تفصیل لکھی ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ قشیریہ، حضرت سہروردیؒ نے "عوارف المعارف" امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" وغیرہ مستقل تصانیف میں اعمال باطنہ کی اصلاح اور ان کی اہمیت پر نہایت تفصیلی بحث فرمائی ہے، اور اس آخری دور میں حضرت حکیم الامت سیدی مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اس موضوع پر التکشف، التشرف، مسائل السلوک، تعلیم الدین، قصد السبیل وغیرہ نہایت جامع کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔

مگر ایک زمانہ دراز سے مسلمانوں کی دین اور علوم دینیہ سے عام غفلت کے نتیجے میں سب ہی علوم دینیہ سے مسلمانوں کی اکثریت بے بہرہ ہوتی چلی گئی، خصوصیت سے آخر الذکر علم جس کا تعلق اعمال باطنہ کی اصلاح سے ہے وہ تو ایسا متروک ہوا کہ عوام تو عوام علماء کی ایک بڑی تعداد بھی اس سے بے تعلق ہو گئی، صرف اعمال ظاہرہ کی پابندی میں دین کو منحصر سمجھ لیا گیا، صدق واخلاص، توحید و توکل، صبر و شکر، قناعت وزہد، تقوی کے صرف الفاظ زبانوں پر رہ گئے، حب جاہ، حب مال، نخوت وغرور، غیظ وغضب، کینہ وحسد جیسے محرمات اور مہلک امراض سے نجات حاصل کرنے کی فکر بھی دلوں سے محو ہو گئی۔

میرا خطاب اس معاملے میں سب سے پہلے اپنے نفس سے اور پھر دوسرے اہل علم سے ہے، کہ ہم نے اپنا ظاہر تو کچھ دین کے مطابق بنالیا ہے، اعمال ظاہرہ کی حد تک ہم پابند شریعت بھی سمجھے جاتے ہیں، اور ایسے تمام گناہوں سے بچنے کا بھی کسی حد تک اہتمام کرتے ہیں جو عوام کی نظر میں منصب علم و علماء کے خلاف سمجھے جاتے ہیں، اور جو لوگ ان میں مبتلا ہوں عوام کی نظر سے گر جاتے ہیں، لیکن باطنی محرمات اور کبیرہ گناہ جو درحقیقت ظاہری

گناہوں سے زیادہ سخت گناہ ہیں ان سے بچنے کا کوئی اہتمام ہم میں نظر نہیں آتا۔

یہاں ایک سوال ہم سب کو اپنے نفس سے یہ کرنا چاہئے کہ ہماری نماز روزہ وغیرہ عبادات اور چوری، بد معاشی، عیاشی، اور سینما وغیرہ عام کھیل تماشوں سے ہمارا اجتناب اگر فی الواقع فکر آخرت اور خوف خدا کے نتیجے میں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ان سے زیادہ بڑے گناہوں میں ہم بالکل بے فکری کے ساتھ مبتلا ہیں، ان میں نہ خوف خدا سامنے آتا ہے نہ فکر آخرت۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے یہ اعمال ظاہرہ خالص اللہ کے لئے ہونے کے بجائے ہماری پیشہ ورانہ ذہنیت کے نتیجے میں ہوں، ان کا تعلق خدا اور آخرت سے نہیں بلکہ اپنے پیشے سے ہو، کہ اگر نماز روزہ وغیرہ چھوڑا گیا یا محرمات ظاہرہ کا ارتکاب کیا گیا تو ہمیں ملے ہوئے منصب تعلیم و فتوی اور امامت و خطابت وغیرہ ہم سے چھن جائیں گے، اس لئے صرف ان گناہوں سے بچنے کا ہم اہتمام کرتے ہیں، جو ہمارے پیشے اور جبہ و دستار میں نہیں کھپتے، اور باطنی گناہ جن پر جبہ و دستار کا پردہ ڈالا جا سکتا ہے ہم نے ان کو شیر مادر سمجھ لیا ہے۔

آج ہماری تعلیم و تبلیغ جو بے اثر ہو کر رہ گئی ہے بلکہ فتنوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بن گئی اس کا واحد سبب ہماری یہ روش ہے۔ انا لله وإنا إليه راجعون.

تجربہ شاہد ہے کہ دنیا میں صرف انہیں علماء کی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کے آثار باقی رہے جن کے قلوب تقوی اور خشیت اللہ اور اخلاص سے لبریز تھے، ورنہ بڑے بڑے محققین کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا۔

اللهم إنا نسألك الهدى والتقى والعفاف والغنى.

تصوف کی حقیقت

اور اس کے معاملے میں افراط و تفریط

پچھلی مجلسوں میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ انسان قلب اور قالب یعنی باطن و ظاہر کے مجموعے کا نام ہے، قرآن و سنت نے جو انسان کی صلاح و فلاح کا مکمل نظام بتلایا ہے اس کے احکام دونوں سے متعلق ہیں، سہولت کے لئے ظاہری اعظاء انسانی سے متعلق احکام عبادات، نکاح و طلاق، معاملات کو علم فقہ میں مدون کر دیا گیا ہے، اور باطن یعنی قلب و روح سے تعلق رکھنے والے احکام اعتقادات و اخلاق کو علم عقائد اور علم تصوف میں الگ الگ جمع کر دیا گیا ہے، اور در حقیقت یہ سب کتاب و سنت کی ہی تعلیمات کے مختلف شعبے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے الگ بھی اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ جیسے ہاتھ الگ عضو ہے، پاؤں الگ، آنکھ اور چیز ہے ناک اور، قلب، جگر، معدہ آنتیں سب الگ الگ اعضاء ہیں، لیکن مجموعہ انسانیت کی تکمیل ان سب کے مجموعے سے ہوتی ہے، ان میں سے کسی ایک کو لے کر دوسرے سے استغناء نہیں ہو سکتا، نہ ایک کا وجود دوسرے کے لئے منافی ہے، نہ ایک کا عمل دوسرے کے عمل سے ٹکراتا ہے۔

اسی طرح عقائد، فقہ، تصوف بلاشبہ الگ الگ علوم و فنون ہیں، مگر انسان کامل یہ مومن و مسلم ان سب کے مجموعے ہی سے بنتا ہے، قرآن و سنت کی پیروی سب پر عمل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، ان میں سے صرف کسی حصے کو لے کر دوسرے سے استغناء ایسا ہی مہلک ہے جیسے کانوں کی حفاظت کریں اور آنکھوں کو ضائع کر دیں، فقہ کو تصوف کے خلاف یا تصوف کو فقہ کے خلاف سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے آنکھوں کو کانوں کے خلاف سمجھنا، جن حضرات کو حق تعالی نے ان تمام تعلیمات قرآن و سنت کا جامع بنایا ہے وہی ان تمام کی حقیقت کو پہچاننے والے ہیں، انہیں کے ارشادات سے ان علوم و فنون کا صحیح مقام اور درجہ معلوم ہو سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"شریعت بغیر طریقت (یعنی تصوف) کے نرا فلسفہ ہے، اور طریقت بغیر شریعت کے زندقہ والحاد۔"

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس ایک جملے میں ان تمام علوم وفنون کی پوری حقیقت کھول دی ہے کہ شریعت یعنی ظاہری اعمال کا علم تو بہت سے منافقین کو بھی تھا، اور آج بھی سینکڑوں یہودی، نصرانی، اور لامذہب دہریئے مستشرقین ان علوم اسلامیہ کے بڑے محقق اور جاننے والے موجود ہیں، مگر وہ نرا فلسفہ ہے، دین نہیں، دین جب ہوگا جب کہ اس کے احکام کے حق ہونے کا اعتقاد بھی ہو، اور ان کے احکام ظاہرہ وباطنہ پر عمل بھی، اس لئے صرف علوم ظاہرہ کی فن دانی اور تحقیقی مباحث نہ کوئی دینی کمال ہے، نہ اللہ ورسول ﷺ کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت ہے۔

اسی طرح طریقت وتصوف کا نام لے کر جو کوئی شریعت کے خلاف چلتا ہے وہ ایک زندقہ والحاد اور قرآن وسنت کی تحریف ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جس کا ظاہر پاک نہ ہو اس کا باطن پاک ہو ہی نہیں سکتا"

چوتھی صدی ہجری کے مشہور عالم اور شیخ صوفیاء امام ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے مشائخ صوفیاء کے لئے جو ایک مفصل پیغام بنام "رسالہ قشیریہ" لکھا ہے، اور بعد کے تمام مصنفین کی کتابوں کا مدار اور متن یہی کتاب سمجھی گئی ہے، اس کے مقدمہ میں بڑی وضاحت سے ائمہ صوفیاء کے مقالات سے ثابت کیا ہے کہ طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ شریعت وسنت پر پوری طرح عمل کرنے کا نام ہی طریقت ہے، اس کے باب اول میں فرمایا کہ اسلام میں نبوت ورسالت کے بعد سب سے بڑی فضیلت صحبت رسول ﷺ سمجھی گئی ہے، اس لئے جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل کیا ان کی سب سے بڑی فضیلت اور سب سے اعلیٰ لقب ان کا "صحابی" ہونا ہے۔

ان کے بعد جن لوگوں نے صحابہ کی صحبت سے علم وعمل حاصل کیاان کاسب سے بڑا تعظیمی لقب ,,تابعی،، اور ان کے بعد کے لوگوں کے لئے ,,تبع تابعی،، قرارپایا، یہ سب حضرات شریعت وسنت پر مکمل عمل کرنے والے، کتاب وسنت کے تمام اعمال ظاہرہ وباطنہ سے پوری طرح آراستہ، شریعت وطریقت کے جامع حضرات تھے، ان کے طبقات اور القاب علوم وفنون کی تخصیصات کے بجائے صحابی، تابعی، تبع تابعی کے عنوان سے تھے، ان کے بعد لوگوں کے طریقے مختلف ہوگئے، بعض کا زیادہ اشتغال تعلیم وتعلم، تصنیف وتالیف میں زیادہ رہا۔

باطنی علوم واعمال میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، مگر اشتغال ان میں کم ہوا، وہ علوم ظاہرہ کے محقق ہوکر عالم، محدث، مفسر، فقیہ کہلائے، اور بعض جن کارخ عمل کی طرف اور اعمال دین کے مکمل اہتمام کی طرف زیادہ رہاوہ عباد، زہاد کہلائے، مگر علوم ظاہرہ شرعیہ میں بھی ان کو کوئی کمی نہیں تھی، مگر عباد وزہاد میں پھر کچھ ایسے لوگ بھی داخل ہوگئے جو طریق سنت سے منحرف (ہوکر) بدعات میں مبتلا ہوئے، اور مسلمانوں میں مختلف فرقے پیدا ہوگئے، ہر فرقے میں کچھ لوگ عباد وزہاد کے نام سے معروف ہوگئے، اس وقت وہ لوگ جو اہل سنت والجماعت کے عقیدے پر قائم شریعت وسنت کے مکمل اتباع کے دلدادہ ہونے کے ساتھ عبادات وزہادت اور اعمال باطنہ کی تکمیل کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے، وہ اہل تصوف کے نام سے موسوم ہوئے، اور دوسری صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے ہی یہ اکابر مشائخ اہل تصوف کے نام سے معروف ہوگئے، جو ظاہر شریعت وسنت پر مکمل عمل کے ساتھ اپنے ایک ایک سانس کی حفاظت اور ذکر اللہ میں مشغول رہنے کا اہتمام کرنے والے، اور غفلت کے ہر خطرے سے بچنے والے تھے، امام قشیریؒ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں :

,,ثم ظهرت البدع وحصل التداعي بين الفرق فكل فريق ادعوا أن فيهم زهادا، فانفرد خواص أهل السنة المراعون أنفاسهم مع الله تعالى الحافظون قلوبهم عن طوارق الغفلة

باسم التصوف واشتهر هذا الاسم لهؤ لاء الأكابر قبل المائتين من الهجرة،،

(رسالة قشيرية ،ص۸)

''پھر مسلمانوں میں بھی کچھ بدعتیں نکل آئیں، اور ہر فرقہ اپنی طرف یہ کہہ کر بلانے لگا کہ ہم میں بھی درویش ہیں، ان کی طرف رجوع کرو، اس وقت امتیاز کے لئے ان خواص اہل سنت کو تصوف کے نام سے ممتاز کردیا گیا، جو اللہ تعالی کے ساتھ تعلق میں اپنے ایک ایک سانس کی حفاظت کرتے ہیں، اور غفلت کے تمام خیالات سے اپنے قلوب کی حفاظت کرتے ہیں، اور تصوف کے ساتھ ان کے نام کی شہرت دوسری صدی ہجری سے پہلے ہی ہو گئی تھی''۔

امام قشیریؒ کی اس تشریح سے ثابت ہوا کہ اہل تصوف اور صوفی کے نام سے سلف کے زمانے میں صرف وہی لوگ معروف ہوئے جو شریعت وسُنّت کے پیرو اور بدعات سے مکمل اجتناب کرنے والے تھے، خالی زہد وریاضت والے جو متبع سنت نہ تھے وہ اس نام سے موسوم نہ تھے، بلکہ ان سے امتیاز پیدا کرنے ہی کے لئے یہ نام اختیار کیا گیا تھا، اور علماء وصوفیاء کے اوصاف میں بجز اس کے کوئی فرق نہیں تھا کہ زمانہ نبوت کے بعد اور ضعف وقوی کے سبب اعمال ظاہرہ وباطنہ میں یکساں کمال، اور بیک وقت دونوں میں مکمل اشتغال ممکن نہ رہا تو علماء نے تعلیم وتعلم تصنیف وفتوی اور علمی موشگافیوں کو اپنے عمل کا موضوع بنالیا، اس کے مدارس قائم کئے، صوفیائے کرام نے باطنی اعمال واحوال کی درستی، اور اس پہلو سے مسلمانوں کی اصلاح وارشاد کو اپنا دائرہ عمل بنالیا، اس کے لئے خانقاہیں آباد ہوئیں، یہ صرف ایک تقسیم کار کا اصول تھا، باہمی اختلاف کا کوئی پہلو نہ تھا، کیونکہ اہل مدارس اپنے باطنی اعمال واحوال سے غافل نہ تھے، اور اہل خانقاہ احکام ظاہرہ شرعیہ سے ناواقف یا ان کی حیثیت کو کم کرنے والے نہ تھے۔

لیکن زمانے کی نیرنگیاں بھی کیا کیا گل کھلاتی ہیں، دونوں طبقوں میں محقق ماہرین کی

کمی شروع ہوئی، اور ایک طرف علماء میں ذکر اللہ اور فکر آخرت سے غفلت کے جراثیم آئے اور اللہ اور رسول کریم ﷺ سے انتہائی محبت کا جو مقام ایمان کامل کے لئے ضروری ہے اس میں کمی آئی، دوسری طرف صوفیاء میں علوم شریعت سے ناواقفیت یا کم علمی کے جراثیم پھیلے، سنت و شریعت کے اہتمام میں کمی آئی، اس کے نتیجے میں مدارس اور خانقاہوں کے ادارے ایک دوسرے کے حریف بن کر ایک دوسرے پر الزام تراشی میں لگ گئے، مدارس میں صرف چند مسائل جان لینے کو کمال سمجھ لیا گیا، اور خانقاہوں میں چند تسبیحات و نوافل کو۔ مدارس میں اعمال باطنہ کا فقدان ہوتا چلا گیا، اور خانقاہوں میں شریعت و سنت کا۔ یہاں تک کہ تصوف صرف چند رسوم کا نام رہ گیا جن کی شریعت و سنت میں کوئی اصل نہیں۔

اس کا دوہرا ضرر امت کو پہنچا، اول تو یہی دو طبقے جو اصلاح مسلمین کے کفیل تھے، خود ان کا مجروح ہو جانا ایک بہت بڑا المیہ تھا، دوسرے ان دونوں کے اختلاف میں شدت اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں، جنہوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔

اس سے زیادہ اشد ایک اور افتاد یہ پڑ گئی کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو ان دونوں طبقوں سے بیزار اور دونوں سے بر سر پیکار ہو گئے، ان کے پاس خود اتنی علمی یا عملی صلاحیت نہ تھی کہ ان دونوں طبقوں سے آزاد ہو کر براہ راست قرآن و سنت کی تعلیمات کو صحیح سمجھتے اور صحیح عمل کو لیتے، اور جن کے ذریعہ یہ دولت حاصل ہوتی ان سے بیزاری پیدا ہو کر ان کی مثال اس بیمار کی سی ہو گئی جو خود اپنے علاج کو نہ سمجھتا ہے اور نہ اس پر قادر ہے اور سارے حکیموں وڈاکٹروں سے بیزار ہو جائے، ایسے حضرات نے علم دین کے محقق اور ماہر اساتذہ سے بیزاری کے نتیجے میں علم دین حاصل کرنے کے لئے صرف دینی کتابوں کے مطالعے پر اعتماد کیا، اور بہت سے قرآنی مسائل میں ایسی راہوں پر پڑ گئے جو جمہور امت کی راہ سے مختلف ہے، اس طرح دین میں ترمیم کا ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا، ان میں سے کچھ لوگوں نے علماء دین کو اپنے الزامات واعتراضات اور استہزاء و تمسخر کا ہدف بنالیا اور کچھ لوگوں نے صوفیاء کرام کو اور بعض نے دونوں کو۔

رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق ہر سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے مختلف ممالک اور مختلف طبقات میں پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اس فساد عظیم کے اسباب کو پہچانا اور اس کا صحیح علاج کیا، اور تجدید دین کی خدمت انجام دے کر دونوں طبقوں کی اصلاح کی، آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور پھر ہندوستان میں حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ کے ہاتھوں بڑی حد تک یہ خدمت انجام پائی، اس کے بعد ہندوستان میں جن اکابر نے دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی وہ سب جیسے علوم شریعت کے اعلیٰ ماہر اور محقق تھے، اسی طرح علم باطن و تصوف میں اعلیٰ کمال رکھنے والے تھے، انہوں نے "دارالعلوم دیوبند" کی بنیاد مدرسہ اور خانقاہ کے امتزاج پر رکھی۔

میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے ہم عصر تھے، جس سال دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی وہی والد مرحوم کا سال پیدائش ہے، والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم کا وہ دور دیکھا ہے جبکہ اس کے عملے میں صدر مدرس اور مہتمم سے لیکر ایک چپراسی اور دربان تک سب صاحب نسبت اولیاء اللہ تھے، جو دربان دروازے پر رہتا تھا ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول تھا، دن بھر مدرسے کی درسگاہوں اور طلباء کے حجروں سے علمی بحثوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، اسی طرح رات کو ہر ہر جگہ سے تلاوت و ذکر اللہ کی دلنواز آوازیں آتی تھیں۔

دارالعلوم کے احاطے میں ابتداءً کوئی مسجد نہ تھی، طلباء و مدرسین قرب و جوار کی مساجد میں نماز ادا کیا کرتے تھے، احقر کی طالب علمی کے زمانے میں دارالعلوم کی اپنی مسجد تعمیر ہوئی، تو اس کا قطعہ تاریخ سیدی شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا تھا، اس کا مصرع تاریخ یہ تھا ؎

"در مدرسہ خانقاہ دیدیم"

یہ مصرع اس روح دارالعلوم کا حامل ہے جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی، اسی امتزاج کے وہ ثمرات طیبہ ہیں جو دنیا کے سامنے آئے کہ یہاں سے پیدا ہونے والے علماء میں

سینکڑوں عالم مرجع خلائق بنے اور اپنے اپنے خطوں میں دینی شعور پیدا کرنے والے اور بدعت وغفلت کے طوفان کا مقابلہ کرنے میں کامیاب داعی ثابت ہوئے۔

اور خاص خاص ایسے اکابر بھی پیدا ہوئے جن میں سے ایک ایک آفتاب وماہتاب بن کر چمکا اور پوری دنیائے اسلام ان کی روشنی سے جگمگا اٹھی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی چند مثالیں ہی اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

اعمال باطنہ

پچھلی مجلسوں میں یہ بات بار بار واضح ہو چکی ہے کہ احکام اسلام دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کا تعلق انسان کے بدن اور اعضاء و جوارح سے ہے، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، صدقہ، نکاح، طلاق، میراث، معاملات تجارت و اجارہ، معاشرت وغیرہ۔ دوسری قسم وہ ہے جن کا تعلق انسان کے قلب و روح سے ہے جن میں ایمان، اخلاص، توحید، صدقہ، اللہ و رسول کی محبت، عظمت، صبر، شکر، قناعت، زہد وغیرہ ہیں۔

پہلی قسم کی صحت و سقم اور صحیح و فاسد کا بیان کتب فقہ میں ہوتا ہے، دوسری قسم کی صحت و سقم اور صحیح و فاسد کا بیان کتب اخلاق و تصوف میں جس طرح پہلی قسم کے احکام دین اسلام کا عظیم شعار ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت احکام اسلام میں قسم دوم کو حاصل ہے۔ مگر سوء اتفاق کہیئے یا کید شیطانی، مسلمانوں کے دیندار طبقوں میں بھی اسلام صرف پہلی قسم کے احکام کو سمجھ لیا گیا ہے، دوسری قسم کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے کہ گویا اسلام میں ان کی کوئی ضرورت و اہمیت ہی نہیں۔ عوام تو عوام علماء اور طلباء علم دین میں بھی اعمال باطنہ کی اصلاح کی طرف سے انتہائی بے فکری اور غفلت کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اسی لئے اس مجلس کا موضوع صرف اعمال باطنہ کو قرار دیا ہے۔

اعمال باطنہ کی مجمل فہرست

جس طرح اعمال ظاہرہ میں کچھ چیزیں فرائض وواجبات اور مستحبات ہیں، جن کے ادا کرنے پر بہت بڑا اجر و ثواب اور نہ کرنے پر سخت عذاب ہے، اور کچھ چیزیں حرام و ناجائز یا مکروہات ہیں جن کے کرنے میں سخت وعیدیں عذاب کی ہیں، اور ان کے چھوڑنے میں ثواب ہے۔ اسی طرح اعمال باطنہ میں کچھ فرائض وواجبات ہیں جن کو فضائل کہا جاتا ہے، اور کچھ چیزیں حرام و ناجائز ہیں جن کو رذائل کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان فضائل و رذائل کی مختصر فہرست یہ ہے، ان کی تفصیلات اگلی مجلسوں میں انشاء اللہ تعالیٰ بیان ہوں گی۔

اعمال باطنہ میں سب سے اہم فرض تو ایمان اور اس کے متعلقہ عقائد ہیں، جن کے بغیر آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا۔ ان کا بیان چونکہ مستقل علم عقائد میں کیا جاتا ہے اور اس کی تعلیم داخل نصاب بھی ہے اس لئے اس مجلس میں ان کے علاوہ دوسرے اعمال باطنہ کا بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں :۔

اعمال باطنہ کے فرائض وواجبات

توبہ، صبر، شکر، رجاء، خوف، زہد، توحید، توکل، محبت، رضا، اخلاص، صدق عملی۔
یہ اصطلاحی الفاظ ہیں ان کی تشریح اور ان کے حصول کے طریقے آئندہ ذکر کئے جائیں گے۔

اعمال باطنہ کے حرام وناجائز

شہوت، آفات زبان، غضب، کینہ، حسد، حب دنیا، بخل، حرص، حب جاہ، ریاء، تکبر وغرور۔

یہ بھی اصطلاحی الفاظ ہیں، ان کا پورا مفہوم وحقیقت اور ان سے بچنے کے طریقے آئندہ ذکر کئے جائیں گے۔

اعمال ظاہرہ اور باطنہ میں ایک خاص فرق

پچھلی کسی مجلس میں یہ بات بتلائی گئی تھی کہ اعمال ظاہرہ اور باطنہ میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ اعمال ظاہرہ آنکھوں سے مشاہدہ کئے جاتے ہیں جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ، اعمال حسنہ آنکھوں سے محسوس ہوتے ہیں، اسی طرح چوری، ڈاکہ، جھوٹ، غیبت، بدمعاشی، عیاشی بھی محسوسات ہیں، ہر آنکھوں والا ان کی برائی بھلائی کو دیکھ کر پہچان لیتا ہے۔
لیکن اعمال باطنہ تکبر، حسد، کینہ، حب جاہ، حب مال، ریاء، بخل، حرص وغیرہ کسی کو

آنکھوں سے نظر نہیں آتے۔ جو شخص ان گناہوں میں مبتلا ہے، مگر ظاہری اعمال کا پابند ہے اس کو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ باطنی فسق و فجور میں مبتلا ہے، وہ لوگوں کی نظروں میں نیک صالح متقی بنا رہ سکتا ہے۔

دوسروں کی نظروں سے باطنی عیوب کا مستور رہنا تو ظاہر ہے اس سے زیادہ قابل فکر یہ ہے کہ باطنی عیوب اور گناہوں کو بسا اوقات وہ شخص بھی نہیں پہچانتا جو ان میں مبتلا ہے کیونکہ جتنے باطنی گناہ اور عیوب ہیں ان کی شکلیں اور آثار ایسے کاموں سے ملتے جلتے ہیں جو حسنات یا مباحات ہیں۔

مثلاً تکبر اور عزت نفس ملتے جلتے دو کام ہیں تکبر حرام ہے اور عزت نفس کی حفاظت مطلوب شرعی ہے۔ حسد اور غبطہ ملتے جلتے ہیں حسد حرام ہے، غبطہ جائز بلکہ مطلوب شرعی ہے۔ کیونکہ غبطہ کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کی قسمت و فضیلت کو دیکھ کر اس کی تمنا کرنا کہ یہ مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ یہ کوئی مذموم چیز نہیں، مذموم حسد ہے جس میں دوسرے کی نعمت و فضیلت کے سلب ہو جانے کی خواہش ہوتی ہے۔

اسی طرح باطن کے جتنے عیوب اور گناہ ہیں ان سے ملتے جلتے دوسرے اوصاف حسنہ ہیں اس لئے خود یہ شخص جو ان عیوب میں مبتلا ہے، بسا اوقات دھوکہ میں رہتا ہے۔ تکبر کو عزت نفس اور حسد کو غبطہ قرار دے کر بے فکر ہوتا ہے۔

اعمال باطنہ کی اصلاح کے لئے

مرشد کی ضرورت

اس لئے اعمال باطنہ کی اصلاح عادتاً اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اپنے آپ کو کسی ایسے شیخ مرشد کے حوالے کر دے جو باطنی فضائل اور رذائل میں پوری بصیرت اور مہارت رکھتا ہو، خود بھی باطنی رذائل سے پاک رہنے کی کوشش میں لگا ہو اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتا ہو۔ پھر اس کی تشخیص و تجویز کے سامنے اپنی رائے کو بالکل فنا کر کے ٹھیک اسی طرح

عمل کرے جس طرح ایک بیمار اپنے آپ کو کسی حکیم یا ڈاکٹر کے حوالہ کر کے اسی کی تشخیص و تجویز پر عمل کرتا ہے، اگر خود بھی حکیم یا ڈاکٹر ہوتا ہے تو بیمار ہونے کی حالت میں اپنی رائے اور اپنی تجویز کو چھوڑ کر معالج کا مکمل اتباع کرتا ہے۔ اعمال ظاہرہ کے صحت وفساد کو تو کسی استاد سے پڑھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے، اور کتابوں کے مطالعہ سے بھی کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں، لیکن اعمال باطنہ کی اصلاح میں محض کسی کتاب کا پڑھ لینا اور پوری طرح سمجھ لینا بھی کافی نہیں ہوتا ان کی اصلاح مرشد کامل کے اتباع کے بغیر عادۃً ممکن نہیں، خرق عادت کے طور پر اللہ تعالی کسی کو کوئی دولت بغیر اسباب ظاہری کے عطا فرمادیں، یہ الگ بات ہے مگر اس کو کام کا طریقہ نہیں کہا جاسکتا۔

اعمال باطنہ کی اصلاح کیلئے امام غزالی کی تجویز

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو حق تعالی نے باطنی امور میں خاص بصیرت عطا فرمائی ہے اور تربیت و تعلیم کا بھی ایک خاص سلیقہ ان کو عطا ہوا ہے، ان کی تجویز یہ ہے کہ :
عیوب نفس اور اپنے باطنی گناہوں سے آگاہ ہونے کے چار طریقہ ہیں۔

پہلا طریقہ مرشد کامل اور اس کا اتباع ہے

سب سے بہتر اور مکمل طریقہ باطنی عیوب سے مطلع ہونے اور ان کی اصلاح کا یہ ہے کہ کسی ایسے شیخ کامل کو تلاش کرے جو شریعت و طریقت کا جامع ہو، باطنی فضائل ورذائل کے پہچاننے میں اور ان کے علاج میں مہارت وبصیرت رکھتا ہو۔

ایک شیطانی فریب اور اس کا جواب

اس موقع پر عام طور سے لوگوں کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ مرشد کامل اس زمانے میں کہاں سے لائیں؟ ہر طرف ہر طبقے میں دھوکہ فریب اور نام ونمود اور نمائش ہے کھرے

کھوٹے کی پہچان مشکل ہے۔ علماء صلحااور درویشوں کے بیشمار تجربے اور ان کی غلط کاریوں کی طویل فہرست اس جگہ شیطان انسان کے سامنے کر کے اس کو مایوس کر دینا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ بکثرت اقبال مرحوم کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں ؎

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی سالوسی ہے سلطانی بھی عیاری

اس فتنہ وفساد اور فسق وفجور کے زمانے کے متعلق اقبال مرحوم کا یہ شکوہ نہ غلط ہے نہ بیجا، مگر اس کا کوئی یہ مطلب قرار دے کہ اب اصلاح حال سے مایوسی ہے اس کا کوئی راستہ نہیں رہا اس لئے اب جو کچھ اپنے جی میں آئے وہ کرو، یہ سراسر غلط فہمی ہوگی۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانے کا یہ شر و فساد اور کوتاہی و کمزوری صرف علماء صلحاء ہی کے طبقہ میں ہے یا تمام طبقات دنیا کا یہی حال ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ اس زمانے میں ڈاکٹری تحقیقات اور نوایجاد آلات وادویہ کی بہتات کے باوجود وہ ڈاکٹر ہزاروں میں ایک ہوتا ہے جو فن کا ماہر بھی ہو اور غور و فکر بھی پورا کرے اور اس کے ہاتھ میں شفا بھی ہو۔

ہزاروں وکیلوں میں کوئی ایک قابل اعتماد واطمینان نظر آتا ہے، لاکھوں تاجروں میں سچائی کی تجارت کرنے والے گنے چنے چند ہوتے ہیں، لاکھوں صنعت کاروں میں کامل ماہر اور قابل اعتماد خاص خاص ہی ہوتے ہیں۔

مگر نہ کسی نے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر اپنے علاج میں خود رائی اختیار کی نہ وکیلوں کو چھوڑ کر خود اپنے مقدمات کی پیروی کی نہ تاجروں سے بیوپار چھوڑا نہ صنعت کاروں سے معاملہ ختم کیا۔ انہیں میں انتخاب اور تلاش کر کے کام چلایا جاتا ہے۔

آج بازار میں نہ گھی خالص ملتا ہے نہ دودھ نہ آٹا نہ مسالہ مگر اس کی وجہ سے کسی کو نہیں سنا کہ اس نے گھی، دودھ کا استعمال چھوڑ دیا ہو یا آٹے کے بجائے کچھ اور کھانا شروع کر دیا ہو۔ ہزار کوششیں کر کے اسی فریب دھوکہ کے بازار میں سے تلاش کرنے والے خالص اور اچھی چیزیں نکال لاتے ہیں۔

آج دین کے معاملہ میں یہی روش کیوں نہ اختیار کی جائے جبکہ دین کے معاملہ میں اللہ تعالی کا یہ وعدہ بھی ہے کہ صادقین کاملین قیامت تک رہیں گے، اور تلاش کرنے والے ان کو ہر جگہ پائیں گے۔ حق تعالی کا ارشاد ہے :

"یاَیّھَا الّذِینَ آمَنُو اتّقُوا اللہ وکُونُوا مَعَ الصّدِقِینَ"

"اے ایمان والو! تقوی اختیار کرو، اور سچے لوگوں کے ساتھی بن جاؤ۔"

سچے لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو زبان، ہاتھ، قول، فعل، ہر چیز کے سچے ہوں، اور یہی خلاصہ ہے ولی کامل کے اوصاف کا۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت میں فرمایا :

یہ حکم سچے لوگوں کے ساتھی بننے کا ظاہر ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کو ہے اس لئے اس میں اللہ تعالی کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ مسلمانوں کا مجمع کسی زمانے میں صادقین سے خالی نہ رہے گا۔

پھر اسی سے امام رازیؒ نے اجماع امت کے حجت ہونے پر بھی استدلال کیا ہے۔ کیونکہ جب مسلمانوں کا مجمع صادقین سے خالی نہیں ہو سکتا تو یہ ممکن نہیں کہ سب مسلمان کسی گمراہی پر جمع ہو جائیں، کیونکہ صادقین گمراہی کا شکار نہیں ہو سکتے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانہ ہر چیز کے خصوصا نیکی اور خیر کے انحطاط اور تنزل کا ہے، دھوکہ فریب اور نمائش و نمود بہت ہے، اصلیت اور حقیقت بہت کم ہے۔ خیر القرون میں خیر اور صدق وصلاح کی کثرت تھی، ہر جگہ ہر گوشہ میں یہی جنس عام تھی۔ آج یہ جنس صلاح بہت تلاش سے ملتی ہے، اور وہ بھی اس معیار کی نہیں ملتی جو سلف کے زمانے میں تھی۔

مگر جیسا کہ اس زمانے میں یہ جنس کمیاب ہو گئی ہے اور اس کی تلاش میں دشواریاں پیدا ہو گئیں ویسے ہی حق تعالی نے اس زمانے کے لوگوں کی مزدوری اتنی بڑھا دی کہ سلف کے زمانے سے اس کی کوئی نسبت نہیں۔

حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ آخری زمانے میں نیک کام کرنے والے

ایک شخص کو پچاس عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ملے گا۔ صحابہ کرام نے سوال کیا کہ پچاس اس زمانے کے یا ہمارے زمانے کے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں تمہارے پچاس کے برابر ملے گا۔

اب آپ اندازہ لگایئے اس فتنے کے زمانے میں جو شخص نیکی پر قائم رہے اس کا اجر پچاس ابوبکر و عمر اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنھم) کے برابر ملے گا۔

ان کے عمل کی یہ مزدوری اسی لئے بڑھائی گئی ہے کہ اس زمانے میں نیک لوگوں کی صحبت بھی بہت مشکل سے حاصل ہوتی ہے اور نیکی پر قائم رہنا بھی انگارے کو ہاتھ میں محفوظ رکھنے کی طرح مشکل ہے۔

ایک اور شیطانی فریب

مرشد کی تلاش اور شیخ کے انتخاب میں شیطان ایک اور فریب میں لوگوں کو مبتلا کرتا ہے وہ یہ کہ اسلاف امت اور اکابر اولیاء اللہ کے حالات جو کتابوں میں مدون ہیں ان کو پڑھ کر وہ اپنے زمانے میں بھی اسی معیار کے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں اور جب وہ نظر نہیں آتے تو مایوس ہو کر اصلاح کا خیال ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

اس میں فریب یہ ہے کہ زمانے کا تنزل و انحطاط ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ قرآن و حدیث اس پر شاہد ہیں۔ آج نہ کوئی ابوبکر پیدا ہوتا ہے نہ عمر نہ دوسرے صحابہ، نہ آج جنید و شبلی واپس آئیں گے، نہ معروف کرخی اور ذوالنون مصری پائے جائیں گے۔ جو شخص ان بزرگوں کے بلند حالات و مقامات کا معیار لے کر تلاش کرے گا اس کے لئے محرومی ضروری ہے، ہونا چاہئے کہ ولی کامل کے لئے جو کم سے کم شرائط ہیں ان کو تلاش کرے تو ہر زمانے میں اور ہر جگہ انشاء اللہ تعالی صادقین کاملین مل جائیں گے۔

اولیاء اللہ کی پہچان

چند چیزیں ہیں۔ اول بقدر ضرورت علم دین جس سے احکام پر عمل کر سکے، اگرچہ ضابطہ کا عالم نہ ہو۔

دوسرے دوام طاعت کہ احکام شرعیہ (فرائض وواجبات) میں کوتاہی نہ کرے اور محرمات ومکروہات سے اجتناب کرے اگر اس میں کبھی لغزش ہو تو فوراً توبہ کرے۔

تیسرے کثرت ذکر یعنی اس کے اکثر اوقات اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں، خواہ وہ ذکر تسبیحات واوراد کا ہو یا خالص اللہ کی رضاجوئی کے لئے، تعلیم دین اور تصنیف وتالیف اور فتوی وارشاد کا ہو۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اخلاص نیت کے ساتھ ذکر اللہ میں داخل ہیں۔

چوتھے یہ کہ وہ کسی باقاعدہ شیخ کامل سے اصلاح وارشاد کی اجازت پائے ہوئے ہو۔

پانچویں یہ کہ اس کی صحبت میں چند روز بیٹھ کر آخرت کی طرف رغبت اور دنیا کے فضول بکھیڑوں سے وحشت کے آثار ظاہر ہونے لگیں۔

بس اتنی علامات جس شخص میں پائی جائیں وہ اصلاح وارشاد کے لئے کافی ہیں، اگر ان اوصاف کے متعدد آدمی سامنے ہوں تو ان میں سے جس کے ساتھ عقیدت ومحبت اور طبعی مناسبت زیادہ ہو اس کو اختیار کرے۔

اصلاح باطن کا دوسرا طریقہ

اگر کسی شخص کو شرائط مذکورہ کے مطابق کوئی شیخ ومرشد دستیاب نہ ہو تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو چاہیے کہ اپنے مخلص دوستوں کو اپنی اصلاح کے لئے اپنے اوپر مسلط کرلے ان سے پوچھا کرے کہ تمہیں میرے اندر کیا کیا عیب نظر آتے ہیں وہ جو کچھ بتلائیں ان کی اصلاح کی فکر میں لگ جائے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے معلوم کیا کہ آپ میرے بھائی ہیں، آپ مجھے یہ بتلائیں کہ آپ نے مجھ میں کیا کیا

عیب دیکھے ہیں ؟ پہلے تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ادب کی بناء پر بیان کرنے سے انکار کیا، مگر جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اصرار کر کے مجبور کر دیا تو فرمایا کہ میں آپ میں دو عیب دیکھتا ہوں۔

اوّل یہ کہ آپ کے دستر خوان پر ایک سے زیادہ قسم کے کھانے ہوتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی عادت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ آپ کے پاس ضرورت سے زائد کپڑوں کا ایک جوڑا ہے، ایک آپ رات کو پہنتے ہیں، دوسرا دن کو استعمال فرماتے ہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا کہ ان دونوں کا تو انشاء اللہ تعالی ابھی علاج ہو جائے گا، آپ اس کی فکر نہ کریں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور تمام اسلاف امت کا یہ ہمیشہ کا معمول رہا ہے کہ اپنے عیوب نفس سے باخبر رہتے، اور ان کا علاج کرنے سے کبھی غفلت نہ برتتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس غیر ملکی سفراء آئے، ان کی وجہ سے مجلس کو آراستہ کیا گیا، دربار سے فارغ ہوتے ہی ایک مشکیزہ اٹھایا اور کنوئیں پر جاکر خود اس میں پانی بھرا اور پڑوس کی ایک بڑھیا کے مکان میں یہ پانی پہنچایا۔

لوگوں نے اس عمل کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ غیر ملکی سفراء کی وجہ سے جو اپنی مجلس کو ایک شان و شوکت کی حیثیت جاننے کی ضرورت پڑی مجھے اس سے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں میرے نفس میں تکبر نہ پیدا ہو جائے، اس کی اصلاح کے لئے ایسا کام کیا جس سے اپنے نفس کی حقارت واضح ہو۔

یہ بھی صحابہ کرام اور اسلاف امت کی خصوصیت تھی کہ دوستانہ طور پر خیر خواہی و ہمدردی سے ایک دوسرے کے عیوب پر اس طرح تنبیہ کر دیتے تھے کہ اس میں مخاطب کی تحقیر و توہین یا نقصان رسانی کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا۔

آج ایسے دوست ملنا بھی آسان نہیں، آج تو عیب دیکھ کر اس کے سامنے تو کچھ نہ کہیں گے مگر دوسروں سے کہتے پھریں گے اور تشہیر کریں گے، ایسے لوگ درحقیقت

دوست نہیں ہوتے، دوست بھی صلحاء اور مخلص تلاش کرنا چاہئیں۔

تیسرا طریقہ

اپنے دشمنوں سے اپنی اصلاح کرائے وہ اس طرح کہ دشمنوں کی باتیں جو اس کی عیب جوئی میں کرتے ہیں، خوب غور سے سنے پھر اپنے حالات کا جائزہ لے کہ اس میں کتنی بات سچی ہے اور کون سا عیب واقعی مجھ میں موجود ہے؟ اس کے ازالہ کی فکر کرے، بزرگان سلف کا عام طریقہ کار یہی تھا۔ اپنے زمانے کے بزرگ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب خانقاہ قدوسی گنگوہ میں مقام فرمایا اور وہاں درس حدیث اور اصلاح ارشاد کا سلسلہ شروع کیا تو شرک وبدعت کی رسموں پر خاص طور سے لوگوں کو تنبیہ فرماتے تھے۔ بعض رسائل بھی ان مسائل کے متعلق شائع ہوئے۔

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی جو اس زمانے میں بہت ہی بدعات کو رواج دے رہے تھے۔ انہوں نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف طرح طرح کے الزامات اور بہتان لگانے شروع کئے اور اشتہارات ورسائل میں انتہائی بدزبانی اختیار کی، یہ رسائل حضرت کے پاس آتے تو حضرت مولانا محمد بخش صاحب سے ان کو پورا سنتے تھے کیونکہ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی، خط وکتابت کا سب کام آپ کے مرید خاص مولانا محمد یحییٰ صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ انجام دیتے تھے۔

یہ رسائل چونکہ انتہائی بدزبانی اور افترا پردازی پر مشتمل ہوتے تھے، ان کا سنانا بھی مولانا کے لئے آسان نہ تھا، کچھ روز تک مولانا نے یہ رسائل حضرت کی خدمت میں پیش نہ کئے چند روز کے بعد دریافت فرمایا کہ مولوی یحییٰ! کیا ہمارے دوست نے ہمیں یاد کرنا چھوڑ دیا؟ بہت دنوں سے کوئی رسالہ میرے خلاف نہیں آیا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ حضرت رسائل تو کئی آئے ہیں مگر میں نے دیکھا کہ ان میں گالیوں اور افتراء وبہتان کے سوا کچھ نہیں،

اس لئے یہ خیال کیا کہ خواہ مخواہ ان کو سنا کر کیوں آپ کے قلب کو مکدر کروں؟ یہ تو مولانا کا اپنا خیال تھا۔

مگر دوسری طرف اللہ کے مقدس بندے تھے جو اپنی ہر ہواؤ ہوس اور عزت وجاہ کو اللہ کے لئے قربان کر چکے تھے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہ کرو جو رسالہ آئے مجھے ضرور سنا دیا کرو۔ میں ان سب کو اس نظر سے سنتا ہوں کہ سو باتیں میرے عیب کی اور میرے خلاف وہ کہتے ہیں، ممکن ہے ان میں کوئی بات سچی ہو تو میں اپنی اصلاح کر لوں۔

چوتھا طریقہ

باطنی عیوب پر مطلع ہونے اور ان کی اصلاح کا یہ ہے کہ آپ کو لوگوں میں جو بات بری اور قابل اعتراض نظر آئے اس کو اپنے نفس میں ٹٹولیں کہ کہیں میرے اندر تو یہ عیب نہیں اگر اس کا کچھ احساس ہو تو فوراً اس کی اصلاح کا اہتمام کریں، اس طرح بھی ایک انسان اپنے عیوب پر مطلع ہو کر اصلاح کر سکتا ہے اور در حقیقت تو ضرورت اُس کی ہے کہ ان سبھی طریقوں سے اپنی اصلاح کی فکر جاری رکھیں بالخصوص پہلے طریقہ کے لئے مقدور بھر پوری کوشش کریں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

نفسانی خواہشات

اور

ان کی قسمیں

پچھلی مجلس میں اعمال باطنہ کی دو قسمیں فضائل ورذائل اور ان کی مجمل فہرست بتلائی گئی تھی جس میں فضائل کا حاصل کرنا اور رذائل سے بچنا مطلوب ہے۔

جیسے نماز میں طہارت مقدم ہے جب تک نجاست سے پاکی حاصل نہ ہو نماز کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا، اسی طرح باطنی فضائل کو حاصل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے دل کو رذائل سے پاک کیا جائے۔

اس لئے آج کی مجلس میں رذائل سے بچنے کی تدبیروں کا بیان شروع ہوتا ہے، رذائل میں سب سے بڑا اور بنیادی رذیلہ اتباع ہوی ہوتی ہے، یعنی اپنے نفس کو اس کی خواہشات وجذبات کے لئے آزاد چھوڑ دینا، اس کے بعد جتنی رذائل کی فہرست آئے گی وہ سب کے سب در حقیقت اسی ایک رذیلہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک انسان اگر اپنے جذبات وخواہشات کو قابو میں رکھ کر شرعی حدود کا پابند بنادے تو وہ تمام رذائل سے پاک ہو سکتا ہے، اور فضائل کو بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔ اور جس نے نفسانی خواہشات وجذبات کو اپنا امام بنالیا تو نفس کی آزاد خواہشات اس کو فضائل سے کوسوں دور اور سینکڑوں رذائل میں مبتلا کر دیں گی۔

اسی لئے قرآن کریم نے بے شمار مواقع میں اتباع ہوی کے مہلک نتائج کو بیان کیا اور رسول کریم ﷺ کی تمام تعلیمات کا مرکز ومحور یہی ہے کہ انسان کو اتباع وپیروی صرف اس ہدایت نامہ کی کرنا ہے جو رب العزت جل شانہ کی طرف سے نازل ہوا، یا جس کی تلقین رسول کریم ﷺ نے فرمائی۔ ہوائے نفسانی اور جذبات نفسانی کی آزادانہ پیروی اس کے لئے زہر قاتل ہے۔

علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''موافقات'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہ بحث کی ہے کہ ساری آسمانی کتابوں کا مقصد اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک اصول پیام صرف ہوی اور ہدی کے دو لفظوں میں سمویا ہوا ہے، ہدی کے اتباع کا حکم ہے اور ہوی کے اتباع کی ممانعت، یہی سارا اسلام ہے اس میں ساری شریعت وطریقت سموئی ہوئی ہے۔

لیکن جیسا یہ کام بنیادی، اصولی اور انتہائی مہم ہے ایسا ہی اس کا حاصل کرنا کچھ آسان نہیں، اس کے لئے کافی جدو جہد اور مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور دنیا میں جس کسی کو ہدایت کے سانچہ میں ڈھل جانے کی یہ دولت نصیب ہوئی ہے مجاہدوں اور ریاضتوں ہی سے حاصل ہوئی ہے ؎

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا جز آہ سحر گاہی

صرف انبیاء علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں کہ ان کے کمالات کسب واکتساب اور مجاہدہ وریاضت پر مبنی نہیں ہوتے، خالص عطاء حق اور موہبت وانعام الٰہی ہوتے ہیں، مگر ان میں بھی عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ مجاہدات سے گذرنا ان کو بھی ہوتا ہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حافظ شیرازی نے کہا ہے ؎

شبان وادی ایمن گہے رسد بمراد
کہ چند سال بجان خدمت شعیب کند

خاتم الانبیاء ﷺ کو عطاء نبوت سے پہلے طبعی طور پر حکومت میں رہنے اور مہینوں غار حرا میں جاکر عبادت میں مشغول رہنے کی رغبت پیدا ہوگئی تھی۔

(صحیح بخاری)

اولیاء اللہ میں بھی شاذو نادر کچھ حضرات ایسے ہوئے ہیں کہ جن کو بغیر مجاہدہ وریاضت کے یہ انعام مل گیا۔

نفسانی خواہشات کی دو قسمیں

صوفیائے کرام کی زبان پر نفس کشی اور خواہشات نفس کی مخالفت کی تاکیدیں بار بار آتی ہیں۔ جو لوگ ان کی اصطلاحات سے واقف نہیں وہ اس کو عام قرار دے کر رہبانیت میں داخل سمجھتے اور ان حضرات پر اعتراض کرنے لگتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہشات نفس کی دو قسمیں ہیں، ایک حقوق نفس دوسرے حظوظ نفس۔ حقوق نفس وہ چیزیں ہیں جن پر نفس کی بقاء موقوف ہے جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا، حرکت، سکون، جنسی تقاضا کو بقدر ضرورت پورا کرنا یہ حقوق نفس ہیں جن کا پورا کرنا صرف جائز نہیں بلکہ مطلوب شرعی ہے، اور خاص حالات میں واجب و فرض ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ان کے پورا کرنے کی تاکید آئی ہے رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے :

”إن لنفسك عليك حقا، وإن لعينك عليك حقا، وإن لزوجك عليك حقا“

تیرے نفس کا بھی تیرے ذمہ حق ہے، تیری آنکھ کا بھی تیرے ذمہ حق ہے کہ کسی قت نیند کے ذریعہ اس کو آرام دے، اور تیری بیوی کا بھی تیرے ذمے حق ہے۔

ان حقوق کا ترک کرنا رہبانیت ہے جو تعلیمات اسلام کے خلاف ہے۔ ہاں دوسری قسم حظوظ نفس ہے یعنی نفس کی وہ لذتیں جو ضرورت بقاء نفس اور بقاء نسل سے زائد ہوں۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں نفس کشی اور مخالفت نفس سے یہی قسم مراد ہے کہ انسان غیر ضروری نفسانی لذتوں کا خوگر نہ ہو کیونکہ اسی راستے سے انسان گناہوں کا شکار ہوتا ہے۔ اور یہ کلام صرف صوفیائے کرام کا نہیں قرآن و سنت کی بے شمار نصوص اس پر شاہد ہیں اس جگہ ایک ہی آیت مثال کے لئے کافی ہے۔

”وأما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فإن الجنة هي المأوى“

جو ڈرا اپنے رب کے سامنے (حساب کے لئے) کھڑا ہونے سے اور اس نے روکا اپنے نفس کو خواہشات سے تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

قرآن و سنت کی اصطلاح میں لفظ ہوئی میں جو ہدیٰ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اس سے مراد وہی ہوائے نفسانی ہے جو حظوظ کی قسم سے ہے، اسی سے بچنے کے لئے مجاہدات اور ریاضات کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مجاہدہ کی حقیقت

یہ ہے کہ ناجائز کاموں اور گناہوں سے بچنے کے لئے بعض جائز کاموں کو بھی ترک کرنے کی عادت ڈالی جائے ایسے مجاہدات خود مقصود نہیں ہوتے، جب نفس پر قابو پالینے کا اطمینان ہو جائے ترک کر دیئے جاتے ہیں، صوفیا کرام کے واقعات شب بیداری، فاقہ کشی، ترک کلام، ترک اختلاط وغیرہ یہ سب اسی طرح کے مجاہدات ہیں۔

مجاہدہ کی حقیقت ایک مثال میں

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور جامع کمالات حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، انہوں نے خود اپنا واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم بچوں سے کچھ دیر تک خوش طبعی کی باتیں کرتے رہے تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا کہ حضرت اکابر سلف سے زائد کلام سے بچنے کے بارے میں بڑی سخت تاکیدیں منقول ہیں، ان کی اصلی حیثیت کیا ہے؟ حضرت مولانا نے والد صاحب کے ہاتھ میں سے ایک کتاب لے کر اس کے ایک ورق کا گوشہ موڑ دیا اور پھر کتاب والد صاحب کو دیدی کہ یہ مڑا ہوا ورق سیدھا کر دو، والد صاحب نے بار بار سیدھا کیا مگر وہ پھر مڑ جاتا تھا، حضرت مولانا ؒ نے پھر وہ کتاب لے کر ورق کے اس گوشے کو اس کے مخالف سمت میں موڑ دیا اور پھر والد صاحب کو کتاب دی کہ اب سیدھا کرو، والد صاحب نے سیدھا کر دیا تو ورق اپنی جگہ سیدھا بیٹھ گیا۔

اس مثال کے بعد فرمایا کہ بس ترک کلام ترک طعام، ترک منام وغیرہ کے مجاہدات کی یہی مثال ہے کہ مقصود تو استقامت اور سیدھا ہونا ہے مگر عادۂ نفس اس وقت تک سیدھا نہیں ہوتا جب تک اس کو دوسرے رخ پر بالکل نہ موڑا جائے، وہ حلال کھانے اور جائز سونے اور حلال کلام پر تبھی مستقیم ہوگا جب کہ اس کو کچھ عرصہ کے لئے بالکل ترک طعام، ترک منام، ترک کلام کا ایسا خوگر بنایا جائے کہ حقوق نفس اور ضرورت سے زائد ان چیزوں کا استعمال نہ کرے، اور جب وہ خوگر ہو جائے تو جائز و حلال چیزوں کا ترک پسندیدہ نہیں رہتا، بلکہ سنت کے مطابق حلال چیزوں کا شکر کے ساتھ استعمال اور حرام سے اجتناب ہی اصل حالت مقصودہ محمودہ ہے۔

علماء طلباء

کتب شریعت کو پڑھ کر حلال و حرام اور مستحب و مکروہ کا علم تو حاصل کر لیتے ہیں جو بہت بڑی نعمت ہے، لیکن ان چیزوں کی عملی پابندی بدون مجاہدات کے نہیں ہوتی بقول غالب ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اس لئے جس طرح علم دین کا حاصل کرنا فرض ہے اسی طرح اس پر عمل کی عادت ڈالنے کے لئے ضروری مجاہدات بھی لازمی ہیں، امت کے تمام علماء ربانی کا یہی طریقہ رہا ہے، اور ہم سے بالکل قریبی دور اکابر علماء دیوبند حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہم اللہ وغیرہم کے جو علمی اور عملی کمالات دنیا میں معروف ہیں وہ صرف کتابیں پڑھنے پڑھانے کے نتیجہ میں نہیں بلکہ ان کے ان مجاہدات کے نتیجہ ہیں جو انہوں نے اتباع ھویٰ سے بچنے کے لئے اختیار فرمائے، اس زمانے کے مناسب مجاہدات کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ مجلس میں آئے گی۔

مقام محبت

"عشق ہی زندگی کا سوز، عشق ہی زندگی کا ساز"

جن باطنی اعمال کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے ان میں سے ایک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے :

"والذین امنوا أشد حبّا للہ"

"اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔"

اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا :

لا یؤمن أحدکم حتی یکون اللہ ورسولہ أحب إلیہ مما سواھما (او کما قال)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اللہ اور اس کا رسول اس کے لئے ہر ماسوا سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے۔

ان آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے۔

محبت کا دعوی کر دینا تو بہت آسان ہے، اور ہر شخص یہ زبانی خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن ۔

وکل یدعی حبا للیلی وليلى لا تقر لھم بذاك

اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ محبت کی کچھ حقیقت بھی دل میں موجود ہے یا نہیں، دنیا کی ہر چیز کی طرح محبت کی بھی ایک علامت ہے اور وہ علامت ہے محبوب کی اطاعت ۔

إن المحب لمن یحب مطیع

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ :

"قل إن کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ"

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب

رکھے گا۔"

اب سوال یہ ہے کہ یہ محبت حاصل کیسے ہو؟اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو دوسری محبتوں سے خالی کرے۔ صوفیاء کرام نے بالکل درست فرمایا ہے کہ قلب ایک ایسابرتن ہے جس میں دو چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں،دل کو اللہ تعالی نے خالصتاً اپنے ہی لئے بنایا ہے،اب اگر یہ دل دنیا کی اور جاہ ومال کی محبت سے بھرا ہوا ہو تو اس میں اللہ کی محبت کیسے آئے؟

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ ایک مرتبہ خانقاہ سے گھر جارہے تھے، مجھے بھی اس طرف جانا تھا، میں بھی ساتھ ہو لیا، راستے میں چلتے چلتے اچانک رکے اور جیب سے کاغذ اور پنسل نکالی پھر کچھ لکھ کر اسے جیب میں ڈال لیا، پھر خود ہی مجھ سے پوچھا" سمجھے مولوی شفیع! کیابات ہوئی؟"میں نے انکار کیا تو فرمایا کہ "دل کا بوجھ کاغذ پر ڈال دیا، ایک کام یاد آیا تھا جو خانقاہ میں واپس آکر کرنا ہے، نہ لکھتا تو دل میں کھٹکتا رہتا،اب دل فارغ ہے" پھر فرمایا کہ "دل کو اللہ نے اپنے لئے ہی بنایا ہے۔"

لہٰذا دل کا صحیح مصرف اللہ کی یاد ہے،بقدر ضرورت دیگر اشیاء کے خیال میں مضائقہ نہیں، لیکن دل کو دنیوی امور ہی کی محبت اور انہی کی فکر سے معمور رکھنا غلط ہے،انبیاء واولیاء میں اور ہم میں فرق یہی ہے کہ دنیوی کام وہ بھی کرتے تھے اور ہم بھی کرتے ہیں، مگر وہ ,,دست بکار ودل بیار،، کے مصداق تھے، خالص دنیا کے کام انجام دیتے وقت بھی ان کا قلب اللہ کے ذکر اور اس کی یاد میں محو ہوتا تھا، اس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ ان کاموں میں ہمارے ہاتھ پاؤں توکم صرف ہوتے ہیں، مگر دل ہمہ وقت دنیا ہی میں مشغول رہتا ہے۔

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ کی گھریلو زندگی کیسی تھی؟انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ اسی طرح گھر میں تشریف لاتے تھے جس طرح دنیا کے سب مرد، لیکن فرق یہ ہے کہ تمام دنیوی امور انجام دینے کے ساتھ ساتھ جب کان میں اذان کی آواز پڑتی تھی تو "مر کأن لم یعرفنا"

"اس طرح اٹھ کر چلے جاتے تھے جیسے ہمیں پہچانتے ہی نہیں۔"

مشہور محدث امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں سے ایک بزرگ حداد (لوہار) تھے، ان کا معمول یہ تھا کہ گرم لوہے پر ضربیں لگاتے لگاتے جس وقت اذان کی آواز کان میں پڑتی تو اگر ہتھوڑا سر سے اوپر اٹھایا ہوا ہوتا تو اسے وہیں پیچھے کی طرف چھوڑ دیتے تھے، اور اس ایک ضرب کو کام میں لانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑی خطیر رقم صرف کر کے ایک باغ لگایا تھا، ایک دن دیکھ بھال کے لئے باغ میں گئے ذرا فرصت ملی تو نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اتنے میں ایک پرندا آ کر کھجوروں کے خوشوں میں الجھ گیا، اور پھڑ پھڑانے لگا، حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہ اس پر پڑی تو ذہن کچھ دیر کے لئے نماز سے ہٹ کر اس طرف متوجہ ہو گیا، سلام پھیرا تو تنبہ ہوا اور جا کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ یہ باغ مجھے اللہ کی یاد سے غافل کرتا ہے اس لئے میں اسے صدقہ کرتا ہوں، اس زمانے میں یہ باغ نو ہزار میں فروخت ہوا۔ (موطا امام مالک)

تو اللہ کی محبت حاصل کرنے کیلئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ دل کو غیر اللہ کی محبت سے فارغ کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرا طریقہ معرفت کی کوشش ہے عقلی طور سے انسان غور کرے تو کسی کے ساتھ محبت کرنے کے عموماً چار اسباب ہوتے ہیں۔ ۱۔ حسن وجمال۔ ۲۔ فضل وکمال۔ ۳۔ ملک ومال اور۔ ۴۔ جود ونوال، اور یہ چاروں چیزیں ذات باری تعالیٰ میں اس درجہ مکمل طور پر پائی جاتی ہیں کہ کسی اور میں نہیں پائی جاسکتیں، مخلوقات میں جہاں کہیں ان میں سے کوئی چیز موجود ہے وہ اللہ ہی کی عطا کردہ ہے، لہٰذا عقلاً اللہ سے زیادہ محبوبیت کا مستحق کوئی نہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

من عرف الله لم يحب غيره ومن عرف الدنيا زهد فيه.

جسے اللہ کی معرفت حاصل ہو وہ اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرے گا، اور جو شخص

دنیا کی حقیقت پہچان لے وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرے گا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کا ہر ذرہ معرفت حق کا راستہ ہے، جس مخلوق پر بھی تفصیلی نگاہ ڈالو وہ اپنے خالق کی عظمت پر دلالت کرے گی۔

محبت الٰہی کے حصول کا تیسرا طریقہ ''ذکر لسانی'' ہے، انسان اگر کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا کرے تو رفتہ رفتہ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو جاتی ہے ''ذکر'' کے دوران اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ذہن اور دل زیادہ سے زیادہ ''ذکر'' ہی کی طرف متوجہ رہے، دوسرے خیالات میں نہ الجھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طریق سلوک میں جمعیت خاطر رکھنا اور مشوشات سے دل کو پاک رکھنا ضروری ہے، غیر اختیاری افکار میں تو مضائقہ نہیں لیکن بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ''غیر ضروری افکار دل کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔''

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مقام محبت کے حصول کا اصلی طریقہ کسی اہل اللہ بزرگ کی طویل صحبت ہے، اپنے آپ کو کسی مرشد کامل کے حوالہ کئے بغیر عموماً یہ مقام حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ ان مقامات کو حاصل کرنے کے طریقے مختلف لوگوں کے اختلافِ طبائع کی مناسبت سے مختلف ہوتے ہیں، اور انہیں کوئی شیخ کامل ہی پہچان سکتا ہے۔

مقام شوق وانس اور رضا بالقضاء

جن اعمال باطنہ کی تحصیل انسان کے ذمہ ضروری ہے ان میں سے ایک "شوق وانس" بھی ہے یہ دونوں علم تصوف کی اصطلاحات ہیں۔ "شوق" کے معنی یہ ہیں کہ "جو اچھی صفت انسان کو حاصل نہیں ہے، اس کی طرف دل مائل ہو۔" اور انس کا مطلب یہ ہے کہ "جو اچھی صفت انسان کو حاصل ہے اس پر دل مسرور ہو" اگر انسان اپنے دل کی دنیا کو درست رکھنا چاہتا ہے تو اس میں یہ دونوں صفات ضرور موجود ہونی چاہئیں۔

لیکن دل کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے، جذبات کی اس پوشیدہ دنیا میں بسا اوقات دو متضاد چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور ایسے وقت میں دل کو صحیح راستے پر قائم رکھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، اچھی چیز کا "شوق" قابل تعریف صفت ہے، لیکن اگر یہی شوق پٹڑی سے اتر جائے تو "ناشکری" اور "حسد" بھی بن سکتا ہے، اگر معاملہ صرف یہاں تک ہے کہ اچھی چیز کی طرف دل مائل ہوتا ہے تو لائق درست ہے۔ لیکن اگر انسان اس کو ذرا آگے بڑھا کر اپنی تقدیر کا شکوہ شروع کر دے تو یہی چیز "ناشکری" ہو گئی، یا اگر اس کو...... دوسرے کے پاس دیکھ کر جلنے لگے تو یہی "حسد" بن گیا۔

اسی طرح اگر انسان اپنی کسی نیکی پر خوش ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ضمیر کا اطمینان وسکون محسوس کرتا ہے تو یہ "انس" ہے، قابل تعریف ہے، اور ایمان کی علامت ہے، چنانچہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا:

"إذا سرّتك حسنتك وسائتك سيّئتك فأنت مؤمن" (أو كما قال)

جب تمہیں اپنی نیکی پر خوشی ہو اور اپنی برائی بری لگے تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو۔

لیکن اگر اس سے خود پسندی پیدا ہو جائے تو یہی "عجب" بن جاتا ہے، جو دل کی ہلاکت کا شاید سب سے بڑا سامان ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنی کسی اچھی صفت پر ہونا اس نقطہ نظر سے ہونا چاہئے کہ اللہ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ چیز عطا فرما دی ورنہ میں خود اس کو حاصل

کرنے کی کوشش کرتا تو قیامت تک نہ کر سکتا، لیکن اگر آدمی خوش اس لئے ہوتا ہے کہ یہ قابل تعریف صفت میرا اپنا کارنامہ ہے، اور اس سے میرے مقام کی بلندی کا پتہ چلتا ہے تو بس یہی خوشی ''عجب'' بن گئی، اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔

دل کی دنیا کے یہ حالات اور ان کا باہمی فرق اتنا باریک ہوتا ہے کہ بسا اوقات انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے، اسی وجہ سے اصلاح باطن کے لئے کسی مرشد کامل کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کے بغیر منزل مقصود تک پہنچنا عموماً مشکل ہوتا ہے۔

رضابالقضاء

قلب کے جن اوصاف حمیدہ کو حاصل کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک ''رضا بالقضاء'' بھی ہے، یہی وہ چیز ہے جو مصیبت کے وقت مسلم اور کافر کے درمیان امتیاز پیدا کرتی ہے، اور جس سے انسان کے غم والم، سکون واطمینان سے بدل جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی تقدیر کے فیصلوں پر ہر حال میں راضی رہے، اور اپنی تقدیر کا شکوہ نہ کرے، نہ اللہ تعالی کے فیصلوں پر اعتراض کرے، بلکہ خوشی ہو یا رنج، تکلیف ہو یا راحت ہر آن یہ بات مستحضر رکھے کہ قدت کی مصلحتوں کے تحت یہی چیز مناسب تھی۔

اس پر عام طور سے ذہنوں میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ رنج سے رنجیدہ اور خوشی سے خوش ہونا تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کو درد ہو اور وہ اس پر کراہنے کے بجائے خوشی کا اظہار کرے، اور اگر کوئی شخص ایسا کرے بھی تو وہ یا تصنع ہوگا یا فطرت کے ساتھ بغاوت۔

اس اعتراض کے جواب میں عارفین نے فرمایا ہے کہ ''رضابالقضاء'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی کو اسباب غم سے غم نہ ہو یا وہ اسباب غم سے الٹا مسرور ہو، بلکہ رضابالقضاء کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان تقدیر پر معترض نہ ہو، اللہ کا شکوہ نہ کرے، ورنہ تکلیف کو تکلیف سمجھنا ''رضابالقضاء'' کے خلاف نہیں، ہاں البتہ بعض صوفیاء کرام پر یہ ''رضابالقضاء''

بطور حال طاری ہو جاتا ہے، اس وقت یہ حال ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے، اس کے بعد واقعتاً انہیں تکلیف سے تکلیف نہیں ہوتی، وہ رنج اور مصیبت میں بھی مست اور مسرور رہتے ہیں، لہٰذا جن صوفیا سے یہ منقول ہے کہ وہ اسباب غم پر خوش ہوئے، اسی غلبہ حال پر محمول ہے، جو محمود اور قابل تعریف تو ہے، لیکن مطلوب و مقصود نہیں۔

بہر کیف "رضابالقضاء" کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ رنج و مصیبت کے حالات میں بھی انسان کے منہ یا دل سے کوئی شکایت کا کلمہ نہ نکلے، اس کے بجائے اس کی زبان ہر وقت اللہ کے شکر اور اس کی حمد ہی سے تر و تازہ رہے، چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کی تلقین یہ ہے کہ انسان کو جب کوئی رنج و تکلیف پیش آئے اسے یہی کہنا چاہئے کہ:

الحمد للہ علی کل حال ہر حال میں تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

اس تعلیم کی عقلی وجہ یہ ہے کہ بیچارے انسان کا علم نہایت محدود ہے، وہ حقیقت میں اپنے بھلے برے کو نہیں پہچانتا، بسا اوقات وہ کسی چیز کو اپنے لئے اچھا سمجھتا ہے، وہ در حقیقت اس کے لئے بری ہوتی ہے، یا کسی چیز کو برا سمجھتا ہے مگر وہ اس کے لئے اچھی ہوتی ہے، اگر انسان اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر دیکھے تو اس کے سینکڑوں شواہد اسے روز مرہ کی زندگی میں مل جائیں گے۔

ایک صاحب کو غیر منقسم ہندوستان میں بریلی سے طوفان میل میں سوار ہونا تھا، گاڑی رات گئے وہاں پہنچتی تھی، وہ گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم کے اندر سو گئے اور اسٹیشن ماسٹر سے کہہ دیا کہ گاڑی کے وقت مجھے جگا دیا جائے، اتفاق سے اسٹیشن ماسٹر کو یاد نہیں رہا اور گاڑی نکل گئی، یہ اٹھ کر اسٹیشن ماسر پر بہت خفا ہوئے، لیکن تھوڑی دیر میں پتہ چلا کہ وہ گاڑی ذرا آگے جا کر ایک شدید حادثے کا شکار ہو گئی، یہ صاحب گاڑی نکلنے کو اپنے حق میں برا سمجھ رہے تھے مگر معلوم ہوا کہ اگر گاڑی نہ نکلتی تو زندہ بچنے کا کوئی سوال نہ تھا۔

اس واقعہ میں تو فوراً پتہ چل گیا کہ جس چیز کو برا سمجھ رہے تھے وہ در حقیقت اچھی تھی، بعض اوقات انسان کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا۔

میرے لڑکے محمد ذکی سلمہ جب چھوٹے سے بچے تھے تو ایک دن میں نے انہیں دیکھا کہ مکان کی چھت کے بالکل کنارے کھڑے ہوئے باہر کو جھک رہے ہیں، صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اگر وہ ذرا اور آگے کو جھکتے تو نیچے گر جانے میں کوئی کسر باقی نہ تھی، میں نے سوچا کہ اگر آواز دے کر انہیں پیچھے ہٹنے کو کہتا ہوں تو کہیں گھبرا کر آگے کو نہ لڑھک جائیں، اس لئے میں کچھ کہے بغیر دبے پاؤں ان کے پیچھے کی طرف سے گیا اور قریب پہنچ کر انہیں اپنی طرف کو زور کا جھٹکا دیا، وہ اندر کی طرف آگرے اور رونا شروع کر دیا، وہ سمجھے کہ باپ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے کہ پکڑ کر گرادیا، لیکن حقیقت میں یہی "ظلم" ان کی جان بچانے کا ذریعہ بن گیا، مگر انہیں کم از کم بچپن تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ باپ نے یہ ظلم کیوں کیا تھا؟۔

لہٰذا جن چیزوں سے ہم اس دنیا میں رنجیدہ ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں در حقیقت وہ اپنی بے خبری اور جہالت کی وجہ سے سمجھتے ہیں، ورنہ یہ تمام واقعات مصلحت و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں، بعض کی حکمت ہمیں آگے چل کر معلوم ہو جاتی ہے، اور بعض کی معلوم نہیں ہوتی۔

اگر انسان کو اپنی اس بے خبری کا استحضار رہے تو وہ ہمیشہ راضی بہ رضا رہیگا، اور اللہ سے یا اس کی تقدیر سے شکایت کے جذبات اس کے دل میں کبھی پیدا نہ ہوں گے۔

لہٰذا رضا بالقضاء کے مقام کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات پر غور کیا جاتا رہے، جنہیں انسان ابتداء میں اپنے لئے مضر سمجھتا ہے مگر بعد میں وہی مفید ثابت ہوتے ہیں۔

جو چیزیں دل کو تباہ کر ڈالتی ہیں

اب تک اعمال باطنہ میں سے فرائض کا ذکر ہوا ہے جن کا حاصل کرنا انسان کے ذمہ ضروری ہے، عام صوفیا انہیں "فضائل" کہتے ہیں اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ان فرائض کا نام "منجیات" (نجات دینے والی چیزیں) رکھا ہے، اس کے بالمقابل اعمال باطنہ میں سے کچھ اعمال حرام و ناجائز ہیں۔ عام صوفیاء انہیں "رذائل" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انہیں "مہلکات" (ہلاک کر دینے والی چیزیں) قرار دیتے ہیں۔

سلوک و طریقت کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں "فضائل" کو حاصل کرنا جسے صوفیائے کرام "تحلیہ" کہتے ہیں اور "رذائل" سے بچنا، جسے "تخلیہ" کہا جاتا ہے، مشائخ طریقت کے ذوق اس معاملہ میں مختلف رہے ہیں کہ سالک طریقت کے لئے "تحلیہ" مقدم ہے یا تخلیہ؟ بعض حضرات صوفیاء کا مذاق تو یہ ہے کہ سالک کو سب سے پہلے "تخلیہ" کی کوشش کرنی چاہئے، یعنی دل کو باطنی رذائل اور مہلکات سے پاک کرنا چاہئے، اس کے بعد "تحلیہ" یعنی "فضائل" کی تحصیل آسان ہو جائے گی، وہ اس کی مثال اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی زمین میں پھل پھول اگانا چاہتا ہے تو یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس زمین کو ہموار کر کے گندگی اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف نہ کر لیا جائے، پہلے خس و خاشاک سے زمین کو خالی کیا جائے گا، اس کے بعد ہی اس میں پھل پھول کے بیج بار آور ثابت ہو سکیں گے، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے دل کی دنیا میں "فضائل" کا چمن کھلانا چاہتا ہے تو اسے پہلے دل کی زمین سے "رذائل" کے خس و خاشاک کو نکالنا ہو گا، پھر اس میں "فضائل" کے پھول کھل سکیں گے۔

صوفیاء کرام رحمہم اللہ کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ "فضائل" کی تحصیل "رذائل" کو دور کرنے پر مقدم ہے، اس گروہ کا کہنا یہ ہے کہ "رذائل" کی مثال اندھیرے کی سی ہے اور فضائل کی مثال روشنی کی سی، اگر کوئی شخص اندھیرے کو دور کرنا چاہتا ہے تو وہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکے گا جب تک وہاں کوئی شمع نہ جلائی جائے، ادھر شمع روشن ہو گی ادھر اندھیرا

فور ہو جائے گا، اسی طرح دل کی دنیا سے ''رذائل'' کا اندھیرا اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک اس میں '' فضائل'' کی شمع روشن نہ کی جائے، ادھر دل میں '' فضائل'' پیدا ہوں گے، ادھر ''رذائل'' خود بخود مٹ جائیں گے۔

بہر کیف! اصلاح باطن کے یہ دونوں طریقے ہی صوفیاء کرام کے درمیان رائج رہے ہیں جو لوگ ''تخلیہ'' کو ''تحلیہ'' پر مقدم سمجھتے ہیں وہ ابتداء میں وظائف واوراد کے بجائے ایسے عملی مجاہدات پر زور دیتے ہیں جن کے ذریعہ نفس کی خواہشات وجذبات پر قابو حاصل ہو، اس کے برعکس جو حضرات ''تحلیہ'' کو مقدم سمجھتے ہیں ان کی زیادہ توجہ ذکر و تسبیح اور وظائف واوراد پر رہتی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کوئی شیخ کامل ہی کرتا ہے کہ کس شخص کے لئے ان دونوں میں سے کونسا طریقہ زیادہ مفید ہے؟

تمام رذائل کی جڑ

اب تک ہم نے ''فضائل'' کا ذکر کیا تھا، اب مختصراً ''رذائل'' کا بیان کرنا ہے، لیکن ان کی تفصیل سننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنی چاہئے کہ دل کے تمام امراض تمام رذائل کی بنیاد در حقیقت نفسانی ہوس کی پیروی ہے، جسے قرآن کریم میں ''اتباع ھویٰ'' کہا گیا ہے، دل کی جس بیماری پر بھی آپ نظر ڈالیں گے، اس کی بنیادی وجہ یہی نظر آئے گی کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کے آگے سپر ڈال کر بے بس ہو جاتا ہے، اگر انسان اپنے نفس پر مکمل قابو حاصل کر لے تو نہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو اور نہ اس کے دل میں کوئی باطنی بیماری پیدا ہو، اسی لئے قرآن کریم اور حدیث میں اتباع ہوی سے بچنے کی باربار تاکیدیں کی گئی ہیں، ارشاد ہے:

''وَلاَ تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِكَ''

اور تم ہوس کے پیچھے نہ چلو کہ وہ تمہیں تمہارے راستے سے بھٹکا دے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا دل باطنی بیماریوں سے پاک ہو اور اس کے

رذائل ختم ہو جائیں تو اسے سب سے پہلے اپنے نفس کو قابو کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔

قرآن کریم پر غور کرنے سے نفس پر قابو حاصل کرنے کے تین طریقے سمجھ میں آتے ہیں، ایک طریقہ عام اور اجمالی ہے، اور دوسرا طریقہ خاص اور تفصیلی، اجمالی طریقہ تو یہ ہے کہ دل میں آخرت کی فکر اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا استحضار پیدا کیا جائے۔

قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

"وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى"

اور رہا وہ شخص جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اور اس نے اپنے نفس کو ہوس سے روکا تو جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہو گا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نفس پر قابو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کے سامنے جوابدہی کا خوف پیدا ہو، جانتا تو ہر مسلمان ہے کہ مجھے ایک دن مرنے کے بعد خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہونا ہے، لیکن یہ حقیقت جتنی یقینی ہے اتنی ہی کثرت کے ساتھ نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے، نفس پر قابو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس حقیقت کو دل میں اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ کسی بھی وقت خدا کے دربار میں حاضری کا تصور دل سے محو نہ ہو، اور یہ بات "مراقبہ موت" سے حاصل ہوتی ہے، انسان کو چاہئے کہ وہ دن میں کم از کم ایک مرتبہ پانچ دس منٹ نکال کر اپنی موت اور موت کے بعد کے احوال کا تصور کیا کرے، اور اپنے روز مرہ کے تذکروں میں موت کے ذکر کو بھی لازمی طور پر شامل کرے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"أكثروا ذكر ها ذم اللذات"

لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز یعنی موت کا کثرت کے ساتھ ذکر کیجئے۔

یہ چیز دل میں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کرے گی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان کے لئے اپنی خواہشات نفس پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔

یہ تو نفس پرستی کا ایک علاج تھا، اس کے علاوہ خواہشات نفس سے جو گمراہیاں پیدا

ہوتی ہیں وہ دو قسم کی ہوتی ہیں، شبہات یعنی فکری اور نظریاتی گمراہیاں، اور شہوات یعنی عملی گمراہیاں، قرآن کریم نے پہلی قسم کی گمراہیوں کا علاج یہ تجویز فرمایا ہے کہ :

''وتواصوا بالحق''

اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کیا کرو۔

اور دوسری گمراہیوں کا علاج یہ بتایا ہے کہ :

﴿وتواصوا بالصبر﴾

یعنی ایک دوسرے کو ''صبر'' کی نصیحت کرتے رہو۔

''صبر'' کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات نفس سے جو تکلیف ہوتی ہے اسے برداشت کیا جائے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ صفت بغیر نیک صحبت کے عموماً حاصل نہیں ہوتی، اسی لئے صوفیائے کرام اصلاح کے لئے کسی مرشد کامل کی طرف رجوع کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں، قرآن کریم نے بھی ارشاد فرمایا کہ :

﴿یا ایھا الذین ! منوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کی معیت اختیار کرو۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ تقوی حاصل کرنے اور نفسانی خواہشات کو قابو میں کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صادقین یعنی صلحاء کی صحبت اختیار کی جائے۔

زبان کی آفتیں

ایک حدیث میں سرکار دوعالم ﷺ نے "زبان" کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ :

"جِرمه صغیرٌ وجُرمه كبير"

اس کا جسم تو چھوٹا سا ہے مگر یہ جرم بڑے بڑے کرتی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی جسم میں جتنے زیادہ گناہ زبان کی اس قدرتی مشین سے سرزد ہوتے ہیں شاید ہی کسی اور عضو سے اتنے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہو، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ اپنی زبان کو پکڑ کر مروڑ رہے ہیں، پوچھا گیا تو فرمایا کہ :

(إن هذا أوردني الموارد)

اس چیز نے مجھے بہت سی ہلاکتوں میں مبتلا کیا ہے۔

زبان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان میں سے بہت سے تو وہ ہیں جن کا گناہ ہونا سب جانتے ہیں، مثلاً جھوٹ، غیبت، گالی گلوچ اور گانا بجانا وغیرہ، ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ یہ چیزیں ناجائز ہیں، اگر کوئی شخص ان کا ارتکاب کرتا بھی ہے تو گناہ سمجھ کر کرتا ہے، دل میں شرمندہ ہوتا ہے، اور یہ امید رہتی ہے کہ کسی وقت اس گناہ سے نجات حاصل کرلے گا۔ لیکن زبان کے بعض سنگین جرائم ایسے ہیں جن کے گناہ ہونے کا احساس بھی لوگوں کو نہیں ہوتا۔ اور جب بیمار کو اپنی بیماری کا شعور ہی نہ ہو تو اس کی صحت کی کیا خاک امید ہوسکتی ہے؟ اس لئے یہ جرائم زیادہ خطرناک اور موجب ہلاکت ہیں، آج اسی قسم کے چند گناہوں کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ لایعنی باتیں

زبان ایک قدرتی مشین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے انسان کو مرحمت فرمائی ہے، تاکہ وہ اس کو ایسے کاموں میں صرف کرے جو اس کے دین یا دنیا کے لئے مفید

ہوں، لہٰذا اگر اس کو کسی ایسے کام میں استعمال کیا جائے جو نہ دین کے لئے مفید ہو نہ دنیا کے لئے، تو یہ اس قدرتی مشین کا بے جا استعمال ہے، اور اسلام میں اس سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے، فضول اور بے فائدہ باتوں میں زبان کا استعمال کرنا ہر اعتبار سے مضر ہی مضر ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے :

"کان ﷺ نزر الکلام طویل الصمت"

آپ کم گو اور زیادہ تر خاموش رہنے والے تھے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی انگوٹھی پر یہ قول نقش کرایا ہوا تھا کہ : **قل الخیر وإلا فاصمت**

نیک بات کہو، ورنہ خاموش رہو۔

علمائے دیوبند میں حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو حضرت میاں صاحب کے لقب سے معروف ہیں) عجیب شان کے بزرگ تھے، مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے، ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ "آج گفتگو عربی میں کریں گے" اس سے قبل چونکہ حضرت نے کبھی ایسی فرمائش نہیں کی تھی اس لئے مجھے حیرت ہوئی تو حضرت نے خود اس کی حکمت بیان فرمائی کہ "عربی میں بلا تکلف بولنے کی مشق نہ تم کو ہے نہ مجھے، اس لئے اس قید کی وجہ سے باتیں کم ہوں گی۔" اور پھر فرمایا کہ "ہماری مثال اس مسافر کی سی ہے جس کی روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی ختم ہونے لگی ہو، اب وہ ایک ایک روپیہ بڑی احتیاط سے خرچ کرتا ہے"۔

۲۔ فضول مباحثے

لایعنی باتوں ہی کی ایک قسم جس میں اہل علم بطور خاص مبتلا ہو جاتے ہیں، فضول بحث و مباحثہ ہے جس کے پیچھے کوئی فائدہ نہ ہو، ایک بحث و مباحثہ تو وہ ہے جس کا مقصد تحقیق حق ہوتا ہے، اور جو طالب علم کی خصوصیت ہے، وہ تو بلاشبہ جائز بلکہ مستحسن ہے، مقولہ مشہور

ہے کہ ''طالب علے کہ چوں وچرانہ کند وصوفی کہ چوں وچرا کند، ہر دورابہ چراگاہ باید رفت''
لیکن یہاں میری مراد بحثوں سے ہے جن کے پیچھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ دوبزرگ حضرت نظام الاولیاء رحمۃاللہ علیہ سے استرشاد کے لئے بلخ سے دہلی پہنچے، حوض پر وضو کرنے بیٹھے تو دونوں میں بحث چھڑ گئی کہ یہ حوض بڑا ہے یا بلخ والا فلاں حوض، کافی دیر تک جانبین سے ''دلائل'' پیش کئے جاتے رہے، حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع ہوگئی، جب دونوں نماز کے بعد حاضر ہوئے اور مدعا عرض کیا تو حضرت نے فرمایا''کیا فیصلہ ہوا؟ کونسا حوض بڑا ہے؟ دونوں خاموش رہے تو حضرت نے فرمایا کہ جاؤ تمہارا علاج یہ ہے کہ دونوں حوضوں کی پیمائش کر کے پہلے اپنی بحث کا فیصلہ کرو، اس کے بعد آگے بات ہوگی۔''

عوام میں بھی یہ مرض آج کل شدید ہورہا ہے کہ دین کی ضروری باتوں سے مطلق بے خبر ہیں، مگر فضول کی بحثوں میں الجھے رہتے ہیں۔ مجھ سے جب کوئی ایسے فضول سوال پوچھتا ہے تو میں جواب میں یہ حدیث لکھ دیتا ہوں کہ :

,,من حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه،،

یعنی انسان کے اسلام کی اچھائی کا یہ جز ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے۔

۳۔ مراء وجدال

پھر جو بحثیں جائز اور مفید ہیں ان میں بھی ایک بڑی آفت ''مراء وجدال'' ہے، آج کل یہ وبا اس قدر عام ہوگئی ہے کہ بحث خواہ کتنی علمی اور مفید ہو، لیکن اس میں ایک دوسرے پر طعن و تشنیع طنز و تعریض اور چوٹیں کسنے کے بغیر تنقید کو تنقید سمجھا ہی نہیں جاتا، اور اس مقصد کے لئے طرح طرح کی ''مہذب'' گالیاں ایجاد کی جاتی ہیں اور اس کو بڑا ہنر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ امام مالک رحمۃاللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ :

,,المراء في العلم يذهب بنور الإيمان،،

علم میں جھگڑا کرنا ایمان کے نور کو زائل کر دیتا ہے۔

کسی نے پوچھا کہ "اگر کوئی کسی شخص کو خلاف سنت کام کرتے دیکھے تو کیا کرے؟"

فرمایا کہ "نرمی سے سمجھا دے اور جدال نہ کرے۔"

واقعہ یہ ہے کہ اس فقرہ بازی سے مسلمان کی دل آزاری کا انفرادی گناہ تو ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ اس کا ایک زبردست اجتماعی مفسدہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کے باہمی افتراق وانتشار کو ہوا ملتی ہے، اور فرقہ بندی اور جماعتی تعصب کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، اگر علمی بحثیں خالص علمی انداز میں کی جانے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ افتراق میں بڑی نمایاں کمی واقع ہو گی۔

مجاہدہ

جمادالثانیہ ۱۳۸۷ھ کے ''البلاغ'' میں بتایا گیا تھا کہ انسان کے دل میں جو خواہشات پیدا ہوتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک حقوق نفس دوسرے حظوظ نفس، حقوق نفس وہ چیزیں ہیں جن پر نفس کی بقاء موقوف ہے، جیسے کھانا پینا، سونا جاگنا، حرکت وسکون اور جنسی خواہش کا بقدر ضرورت پورا کرنا یہ سب نفس کے حقوق ہیں جن کا پورا کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ خاص حالات میں فرض اور واجب ہے، ان حقوق کو چھوڑنا ''رہبانیت'' کے ذیل میں آتا ہے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دوسری قسم ''حظوظ نفس'' سے مراد نفس کی وہ لذتیں ہیں جو بقاء نفس اور بقاء نسل کی ضرورت سے زائد ہوں، صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ''نفس کشی'' اور ''مخالفت نفس'' سے مراد انہی لذتوں کو چھوڑنا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان غیر ضروری نفسانی لذتوں کا خوگر نہ بنے، اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ

﴿وأما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فإن الجنة هي المأوى﴾

اور رہا وہ شخص جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

قرآن وسنت کی اصطلاح میں ''ھویٰ'' جو ''ہدیٰ'' کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے اس سے مراد وہی خواہشات نفسانی ہیں جو ''حظوظ'' کی قسم میں داخل ہیں، انہی سے بچنے کے لئے ''مجاہدات'' اور ''ریاضتوں'' کی ضرورت پیش آتی ہے۔

''مجاہدہ'' کی حقیقت یہ ہے کہ ناجائز کاموں اور گناہوں سے بچنے کے لئے بعض جائز کاموں کو ترک کرنے کی بھی عادت ڈالی جائے، ایسے مجاہدات خود مقصود نہیں ہوتے، بلکہ

جب نفس پر قابو پالینے کا اطمینان ہو جائے تو ک کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ,, مجاہدات ،، کی مثال ایسی ہے جیسے کتاب کا ایک ورق دائیں جانب مڑ جائے تو آپ اسے لاکھ سیدھا کرنا چاہیں تو اس وقت تک سیدھا نہ ہو گا جب تک اسے بائیں جانب نہ موڑ دیں بالکل اسی طرح مجاہدہ کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ نفس کو حلال پر مستقیم اور سیدھا کیا جائے، لیکن جو نفس حرام کا خوگر بنا ہوا ہو، اسے حلال پر اسی وقت سیدھا کیا جاسکتا ہے جب کچھ روز اسے کچھ جائز و حلال کاموں سے بھی پرہیز کرایا جائے اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

,,ترکنا تسعة أعشار الحلا ل خشية الحرام،،

ہم نے حرام کے ڈر سے حلال کے بھی دس میں سے نو حصے چھوڑے۔

اور یہ در حقیقت آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد پر عمل ہے کہ :

,,الحلال بيّن والحرام بيّن وبينهما مشتبهات ومن حال حول الحمى أو شك أن يقع فيه،، أو كما قال ﷺ.

حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی، اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، اور جو شخص چراگاہ کے ارد گرد گھومتا ہے قریب ہوتا ہے کہ وہ اس میں پڑے۔

عام مشاہدہ ہے کہ جماعت کی ٹھیک ٹھیک پابندی (کہ تکبیر اول بھی فوت نہ ہو) اسی وقت ہو سکتی ہے جب آدمی تحیۃ المسجد کا عادی ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص "تحیۃ المسجد" کی (جو خالصتاً نفل ہے) اس لئے پابندی کرے کہ اس کی وجہ سے نماز باجماعت کی پابندی ہو سکے تو یہی "مجاہدہ" ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص حرام وناجائز گفتگو سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو کم گوئی کا عادی بنائے تو اسی کو "مجاہدہ" کہا جائے گا۔

قدیم زمانے کے صوفیاء کرام نے اس مقصد کے لئے بڑے سخت اور پر مشقت مجاہدات کئے ہیں ان کے یہاں اجمالی طور سے چار مجاہدات کا رواج تھا :

ترک طعام، ترک منام، ترک کلام، ترک اختلاط مع الانام۔

ہمارے زمانے کا مجاہدہ

لیکن ہمارے زمانے میں قویٰ ان سخت مجاہدات کے متحمل نہیں رہے، اس لئے ہمارے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہدہ میں "ترک" کو "تقلیل" سے بدل دیا ہے، حضرت فرماتے تھے کہ اس زمانے میں اگر کھانا پینا سونا بالکل چھوڑ دیا جائے تو صحت کی خرابی کی وجہ سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان کا خطرہ ہے، اس لئے آج کا مجاہدہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں ضرورت تک کمی کی جائے۔

پھر ان میں بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں کھانے اور سونے کی کمی پر تو زور نہیں دیتا، کیونکہ اس کی حدود کا پتہ لگانا شیخ کے لئے بھی مشکل ہوتا ہے، جب تک حالات کا بالکل صحیح صحیح علم نہ ہو بسا اوقات اس سے صحت خراب ہوجاتی ہے، البتہ حضرت کے یہاں دو چیزوں پر سخت پابندی تھی، تقلیل کلام اور تقلیل اختلاط، یعنی آپ اپنے متوسلین کو گفتگو کم کرنے اور لوگوں سے کم ملنے جلنے کی مشق کرواتے تھے، لہٰذا جو شخص اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح چاہتا ہے، اس کے لئے ان دو چیزوں میں مجاہدہ کرنا ضروری ہے۔

ان دونوں چیزوں پر پابندی کا عمل شروع سے چلا آتا ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی انگوٹھی پر نقش کرایا ہوا تھا کہ :

"قل الخير وإلا فاصمت"

بھلائی کی بات کہو، ورنہ خاموش رہو۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے دو **متضاد** مقولے مشہور ہیں، ایک یہ کہ

"أقلل من معرفة الناس"

لوگوں سے جان پہچان کم کرو۔

اور دوسرے

"أكثر من معرفة الناس"

لوگوں سے جان پہچان زیادہ پیدا کرو۔

لیکن در حقیقت دونوں میں تضاد نہیں، پہلے جملے میں لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین کی طرف غفلت کا شکار ہیں، اور دوسرے جملے میں وہ لوگ مراد ہیں جو دین کے پابند ہیں اور اللہ سے لو لگائے ہوے ہیں۔

ایک اہم بات

لیکن یہاں ایک اہم بات یاد رکھنے کی ہے، اور وہ یہ کہ لوگوں سے میل جول کم رکھنا بلاشبہ ''مجاہدہ'' کا ایک اہم جزو ہے، لیکن اس میں یہ نیت ہرگز نہ ہونی چاہئے کہ لوگ خراب ہیں، اس لئے ان سے پرہیز کیا جارہا ہے، کیونکہ یہ تو عین تکبر اور خود پسندی ہے، بلکہ دوسروں سے دور رہنے میں نیت یہ کرنی چاہئے کہ میرے اعمال خراب ہیں اور میں قلب کے اعتبار سے بیمار ہوں، اس لئے کہیں یہ میری بیماری دوسروں کو نہ لگ جائے، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص دوسرے لوگوں کو اپنے سے خراب اور اپنے سے زیادہ فاسق و فاجر سمجھ کر ان سے الگ رہے گا تو اس تکبر سے تو بازار میں پھرنا اچھا ہے۔

بہر حال! کم گوئی اور لوگوں سے کم میل جول کی عادت ڈال لی تو وقت بھی بچے گا، اور انشاء اللہ بہت سے گناہوں سے بھی خود بخود نجات مل جائے گی۔

''مجاہدہ'' کے بعد اصلاح اعمال کے لئے کون کون سے اقدامات ضروری ہیں؟ ان کا بیان انشاء اللہ آئندہ ہوگا۔

اصلاح کی طرف پہلا قدم توبہ!

صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی باطنی دنیا صحت مند ہو، دل کے امراض دور ہو جائیں اس کے نتیجے میں اسے رضائے خداوندی حاصل ہو اور وہ عذاب جہنم سے محفوظ رہے تو اس کی راہ کا پہلا قدم "توبہ" ہے، اس لئے آج کی محفل میں اس سے متعلق چند ضروری باتیں عرض کرنی ہیں۔

عام طور سے لوگوں کے ذہن میں توبہ کا مفہوم یہ ہے کہ صرف زبان سے "استغفر الله ربی من کل ذنب وأتوب إلیه" کاورد کرلیں، حالانکہ یہ بڑی سخت غلط فہمی ہے توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے پچھلے گناہوں پر حسرت وندامت ہو، حتی الامکان اسکے تدارک کی فکر کی جائے، اور آئندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کا مکمل عزم ہو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں "خیر" اور "شر" ملے جلے رہتے ہیں اس میں "تقویٰ" کے دواعی بھی موجود ہیں، اور فسق وفجور کے بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو آپ کو نیکی کی ترغیب دیتی ہیں، اور بہت سی وہ ہیں جو آپ میں گناہ کرنے کا داعیہ پیدا کرتی ہیں، آپ کا فرض یہ ہے کہ گناہ کے دواعی کو مغلوب کر کے نیکی کے دواعی کو اس پر غالب کردیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال اس "سونے" کی سی ہے جس میں کھوٹ ملا ہوا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے سونے سے آپ اس وقت تک کام نہیں لے سکتے جب تک کہ سونے کو کھوٹ سے الگ نہ کرلیں جس کا واحد ذریعہ آگ کی تپش ہے، یہ آگ کی تپش ہی سونے کو کھوٹ سے جدا کرتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بالکل اسی طرح انسان کے "نیک" کو "بد" سے ممتاز کرنے کے لئے بھی "تپش" کی ضرورت ہے، یہ "تپش" جو انسان کو کھوٹ سے نجات

عطا کرتی ہے، دو طرح کی ہے، ایک عذاب جہنم کی تپش کیونکہ مومن کے لئے جہنم کی آگ بھی در حقیقت کھوٹ ہی کو الگ کرنے کے لئے ہو گی، محض جلانا مقصد نہیں ہو گا، بلکہ پاک صاف کر کے جنت میں داخل کرنا مقصود ہو گا، (بخلاف کافروں کے، کہ انہیں دائمی طور پر جلنے ہی کے لئے جہنم میں ڈالا جائے گا) اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿وهل نجازی إلا الكفور﴾

دوسری قسم کی "تپش" حسرت و ندامت کی تپش ہے یہ ایسی آگ ہے جو اس دنیا میں کھوٹ کو پگھلا سکتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کو کھوٹ سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان دو قسموں میں سے کسی ایک قسم کی آگ میں جلنا ضروری ہے، اب اگر وہ چاہے تو جہنم کی آگ کو اختیار کر لے، اور اگر یہ بات اسے مشکل معلوم ہوتی ہے، چنانچہ واقعتاً بھی یہ بڑی مشکل ہے...... تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسی دنیا میں اپنے دل کے اندر حسرت و ندامت کی تپش اور سوزش پیدا کرے، اسی تپش اور سوزش کا نام توبہ ہے۔

اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

"إنما التوبة الندامة"

توبہ ندامت ہی کا نام ہے۔

توبہ کے تین درجے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ندامت کس طرح پیدا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ندامت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ "علم" ہے، کیونکہ جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ غلط یا مضر تھا، اسے اپنے کئے پر کبھی پشیمانی نہیں ہو گی، جس شخص کو یہی پتہ نہ ہو کہ جو چیز میں نے کھائی ہے وہ زہر تھی، اسے ندامت کیسے ہو؟ ندامت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اسے یہ علم ہو کہ میں نے زہر کھایا ہے، اور یہ میرے لئے مہلک ہے۔

بالکل اسی طرح جب تک آدمی کو یہ علم نہ ہو کہ جو کام میں نے کیا ہے وہ برا، ناجائز یا عذاب جہنم کا موجب ہے، اس وقت تک اسے اپنے اس فعل پر ندامت نہیں ہو سکتی، لہٰذا اگر ندامت کی تپش پیدا کرنی ہے تو اس کا پہلا راستہ یہ ہے کہ گناہ کے گناہ ہونے کا علم پیدا کیا جائے، اور علم بھی محض رسمی اور لفظی علم نہیں، بلکہ ایسا علم جو دل میں فکر آخرت، خوف خدا اور گناہ کی لذت سے زیادہ اس کی نفرت پیدا کرے، اسی لئے قرآن کریم نے اللہ سے ڈرنے کو علم کی علامت قرار دیا ہے ارشاد ہے:

﴿إنما يخشى الله من عباده العلماء﴾

اللہ کے بندوں میں سے جاننے والے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

جس شخص کے دل میں خوف خدا اور فکر آخرت نہ ہو اور جسے گناہوں کی تباہ کاری کا علم یقین حاصل نہ ہو وہ عالم نہیں، بدترین جاہل ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

جان جملہ علم ہا این است واین
کہ بدانی من کیم در یوم دیں؟

جب تک گناہوں کے بارے میں یہ یقینی علم حاصل نہ ہو کہ وہ ظاہری طور پر کتنے ہی نظر فریب کیوں نہ ہوں، حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں، قرآن کریم کی اصطلاح میں انسان عالم نہیں کہلا سکتا اور نہ اس کے بغیر توبہ کی حقیقت حاصل ہو سکتی ہے۔

اس "علم" کو پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں غور کر کے گناہوں کے وبال اور عذاب کا استحضار پیدا کیا جائے، اور ان کی تباہ کاریوں کو مراقبہ کے ذریعہ ذہن میں خوب اچھی طرح جمایا اور بٹھایا جائے، شیخ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل کتاب میں گناہوں کی فہرست جمع کر دی ہے، جس میں تین سو گناہ کبیرہ شمار کئے ہیں، اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے، حافظ زین الدین بن نجیم رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی اس موضوع پر مستقل کتابیں ہیں، اور اردو میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تصانیف اور بالخصوص "جزاء الاعمال" میں اس پہلو کو واضح فرمایا ہے،

ان کتابوں کا مطالعہ مذکورہ "علم" کے حاصل کرنے کے لئے مفید ہوگا۔

اس "علم" کے بعد توبہ کا دوسرا درجہ "ندامت" ہے، ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کو کسی ناجائز فعل کے تباہ کن ہونے کا یقینی علم حاصل ہو جائے گا تو اگر اس نے ماضی میں وہ ناجائز فعل کیا ہے تو اس کو لازماً اپنے کئے پر "ندامت" اور پشیمانی ہوگی۔

اس کے بعد تیسرا درجہ "تدارک" ہے جس کے لئے دو کام کرنے ضروری ہیں :

(۱) آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم۔

(۲) ماضی میں جو گناہ ہوئے ہیں اگر وہ حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں تو ان کی حتی المقدور ادائیگی، مثلاً اگر کسی کا مال غصب کیا ہے تو اسے واپس کیا جائے، کسی کو ہاتھ یا زبان سے تکلیف پہنچائی ہے تو اس کے بدلے کے لئے تیار ہو کر اس سے معافی کی درخواست کرنا وغیرہ۔

اور اگر وہ گناہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتا ہو تو جن گناہوں کا قضا یا کفارہ سے تدارک ممکن ہو، ان کا اسی طرح تدارک کرنا، مثلاً اگر نمازیں یا روزے چھوڑ دیئے ہیں تو ان کی قضا کی جائے، یا اگر قسم کھا کر توڑی ہے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔

اور اگر گناہ ایسا ہے کہ شریعت میں قضاء یا کفارہ کے ذریعہ اس کا تدارک ممکن نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے پوری عاجزی کے ساتھ استغفار کرنا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ان تمام چیزوں کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا، اور وہ ہمیشہ توبہ کے وقت سابقہ گناہوں کے تدارک کی ہر امکانی کوشش کام میں لانے کی تلقین فرماتے تھے۔

اگر اس طریقے پر گناہوں سے توبہ کی جائے تو بقول حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شخص چند لمحوں میں ولی کامل بن سکتا ہے، اس لئے کہ حدیث میں سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ : "التائب من الذنب كمن لا ذنب له"

گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے وہ شخص جس نے کبھی گناہ ہی نہ کیا ہو۔

توبہ کا یہ دروازہ ہر شخص کے لئے اس وقت تک کھلا ہوا ہے جب تک نزاع کی کیفیت اس پر طاری نہیں ہو جاتی، اس کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔

صبر اور اس کی قسمیں

"توبہ" کے بعد دوسرا قدم یہ ہے کہ انسان اپنی ظاہری اور باطنی زندگی کی اصلاح کی فکر کرے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے انہیں بجالائے، اور جن چیزوں سے روکا ہے، ان سے باز رہے، ظاہری زندگی میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے انہیں "مامورات" کہا جاتا ہے، مثلاً نماز روزہ وغیرہ اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے انہیں منہیات کہتے ہیں، مثلاً چوری، شراب نوشی وغیرہ، مامورات اور "منہیات" علم فقہ کا موضوع ہیں اور یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

البتہ بالکل اسی طرح ہماری باطنی زندگی کے بھی کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اور کچھ ایسے ہیں جن سے روکا گیا ہے، علم تصوف کی اصطلاح میں پہلی قسم کے اعمال کو **"فضائل" اور دوسری** قسم کو "رذائل" کہا جاتا ہے، یہاں پہلے فضائل کا بیان کیا جائے گا، **اس کے بعد "رذائل"** کا۔

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جب انسان کو کسی "فضیلت" کی ایسی عادت پڑ جائے کہ وہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے تو اس کو تصوف کی اصطلاح میں "مقام" کہتے ہیں، لہٰذا جب ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے "مقام صبر" حاصل کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "صبر" کا باطنی عمل جو "فضائل" میں سے ہے، اس کے اندر خوب راسخ ہو کر اس میں اچھی طرح رچ بس گیا ہے۔

آج کی محفل میں "مقام صبر" کے بارے میں کچھ ضروری باتیں عرض کرنی ہیں۔

"صبر" کے لغوی معنی ہیں "روکنا" اور اسلامی اصطلاح میں "صبر" کی تعریف ہے:

"اپنے آپ کو ناجائز خواہشات سے روکنا"

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن کریم اور اسلام کی اصطلاح کے مطابق ''صبر'' کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کسی تکلیف یا رنج پر واویلا نہ کیا جائے (جیسا کہ عام گفتگو میں ''صبر'' کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے) بلکہ اس کے شرعی معنی بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں، اور اس میں دین کے تقریباً تمام شعبے داخل ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جس قدر تاکید ''مقام صبر'' حاصل کرنے کی آئی ہے اتنی تاکید شاید ہی کسی اور چیز کی آئی ہو، اور اس کا اجر و ثواب بھی اتنا بتلایا گیا ہے کہ شاید کسی اور چیز کا نہ بتایا گیا ہو، چنانچہ ارشاد ہے :

﴿وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر﴾

تم ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی نصیحت کرو۔

اور فرمایا جاتا ہے :

﴿إنما يوفى الصابرون أجرهم بغير حساب﴾

بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کے اجر سے بے حساب نوازا جائے گا۔

''صبر'' کی مندرجہ بالا اہمیت کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہو گی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالی نے انسان میں بھلائی کا مادہ بھی رکھا ہے، اور برائی کا بھی، قرآن کریم کا ارشاد ہے :

﴿فألهمها فجورها وتقواها﴾

اللہ نے انسان کی جان کو گناہ اور تقویٰ دونوں سے باخبر کر دیا ہے۔

اور چونکہ دنیا میں آزمائش کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان برائی کو چھوڑ کر بھلائی اختیار کرے، اس لئے اللہ نے بھلائی کے مادے کی تقویت کے لئے بھی کچھ سامان مقرر فرمائے ہیں، اور برائی کے مادے کو تقویت دینے کے لئے بھی۔

انسان کو بھلائی کی طرف راغب کرنے کے لئے ایک قوت تو خود انسان کے دل میں رکھی گئی ہے جسے ''نفس لوامہ'' کہا جاتا ہے، اور عرف عام میں اس کا نام ''ضمیر'' ہے، ہر انسان جب کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو ایک ان دیکھی قوت اسے برائی سے روکتی ہے، یہی

قوت ''نفس لوامہ'' ہے، اس کے علاوہ کچھ خارجی طاقتیں ہیں جو انسان کو نیکی پر آمادہ کرتی اور برائی سے روکتی ہیں، یہ خارجی قوتیں ''فرشتے'' ہیں جو اللہ تعالی کی فرمانبردار مخلوق ہے، اور اس میں برائی کامادہ پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

دوسری طرف دو قوتیں ایسی ہیں جو انسان کو برائی کی طرف راغب کرتی ہیں، ان میں سے ایک خود انسان کے باطن میں موجود ہے جسے ''نفس امارہ'' کہا جاتا ہے، یہ نفسانی خواہشات کا وہ منبع ہے جو نیکیوں سے جی چرانے اور گناہ کی طرف مائل ہونے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اور دوسری قوت ''شیاطین'' کی ہے، جنہوں نے اپنا مقصد زندگی ہی یہ قرار دیا ہوا ہے کہ انسان کو نیکیوں سے ہٹا کر برائیوں کی طرف لے جائیں۔

ان دو متضاد قوتوں کی کشاکش ہی میں انسان کی آزمائش ہے، اور اس آزمائش میں کامیاب ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان نیکی کے تقاضوں کو بدی کے تقاضوں پر غالب کردے، اور اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''صبر'' ہے۔

اس مقام کا حصول محض زبانی جمع خرچ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے بڑی محنتیں کرنی پڑتی ہیں، صوفیاء کرام نے بیشتر مجاہدات اسی مقام کو حاصل کرنے کے لئے مقرر کئے ہیں، یہ جو بہت سے صوفیاء کرام سے منقول ہے کہ انہوں نے بعض مرتبہ مباحات کو بھی ترک کردیا، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان مباحات کو حرام سمجھتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے نفسانی خواہشات کو قابو میں کرنے کے لئے ایسا کیا ہے۔

شروع میں انسان کو نفسانی خواہشات کے دَبانے میں مشقت ہوتی ہے، لیکن جب ایک مرتبہ یہ کڑوی دواپی لے تو پھر رفتہ رفتہ اللہ تعالی اس کے لئے یہ کام بہت آسان کردیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا نفس ''نفس مطمئنہ'' بن جاتا ہے، یعنی اس میں بھلائی کے تقاضے اس قدر غالب ہو جاتے ہیں کہ بدی کے تقاضے ان کے سامنے بالکل مردہ اور مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں، اسی بات کو آنحضرت ﷺ نے اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ :

''من یتصبّر یصبّرہ اللہ''

جو شخص مقام صبر تک پہنچنا چاہے اللہ اسے صبر دے دیتا ہے۔
اور جس شخص کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کے بارے میں سرکار (ﷺ) کا ارشاد یہ ہے کہ :

"لم یوت أحد نعمة أوسع من الصبر "(او کما قال علیه السلام)

کسی شخص کو صبر سے زیادہ وسیع نعمت کوئی نہیں دی گئی۔

اس مقام کو حاصل کرنے کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے جنہیں "صبر" کی نعمت حاصل ہے تجربہ شاہد ہے کہ انسان کے ماحول اور صحبت سے زیادہ اس کا مربی کوئی نہیں ہوتا، اگر انسان "صابرین" کا ماحول اختیار کر لے تو رفتہ رفتہ خود بھی "صابر" بن جائے گا۔

اس کے علاوہ مقام صبر حاصل کرنے کا انفرادی طریقہ یہ ہے کہ جب بھی دل میں کسی گناہ کا خیال پیدا ہو اس کے ساتھ اس عذاب اور وعید کا تصور جمائے جو قرآن کریم اور احادیث میں اس گناہ کے کرنے والے کے لئے بیان فرمایا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اپنی موت، انجام اور قبر کی تنہائی کو یاد کرے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے تلقین فرمائی ہے کہ :

"أكثروا ذكرها ذم اللذات"

تمام لذتیں ختم کر دینے والی چیز (یعنی موت) کو کثرت سے یاد کیا کرو۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے "صبر" کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور جن کی نیکیوں کی قوت بدی کی قوت پر غالب ہے انہیں بھی کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہئے، حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ اپنے خلفاء کو اس کی تلقین فرماتے تھے کہ وہ کسی وقت اپنی اصلاح سے غافل نہ ہوں، ایک دن خلفاء سے خطاب کرتے ہوئے حضرتؒ نے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کی ایک حکایت نقل فرمائی کہ ایک لکڑہارا روزانہ منہ اندھیرے جنگل جاتا، اور شام کو لکڑیاں لے کر لوٹتا تھا، ایک دن ایک لکڑی کے ساتھ یک سردی سے ٹھٹھرا ہوا سانپ بھی بندھ کر آگیا، راستہ بھر تو وہ بے حس و حرکت رہا، اور لکڑہارے کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا، لیکن جب گھر پہنچ کر اس میں کچھ گرمی پیدا ہوئی تو اس نے ابھرنا شروع کیا، اور لکڑہارے کے لئے

خطرۂ جان بن گیا۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''نفس امارہ'' کی مثال بالکل اس ٹھٹھرے ہوئے سانپ کی سی ہے جو مرا نہیں، بلکہ وقتی طور پر افسردہ ہو گیا ہے ؎

نفس اژدہا است، او کے مردہ است
از غم بے آلتی افسردہ است

اس لئے اس سے غافل اور بے فکر ہونے کے کوئی معنی نہیں، یہ واقعہ نقل کر کے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ بات میں صرف آپ ہی سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ خود اپنا نفس بھی میرا مساوی طور سے مخاطب ہے، اور بحمد للہ اس بات پر کاربند بھی ہوں، اور یہ کہہ کر اپنے ڈیسک سے کچھ پرچے نکال کر دکھلائے جن پر کچھ ہدایات لکھی ہوئی تھیں، اور فرمایا کہ میں اپنے اندر جو کمزوریاں محسوس کرتا ہوں یہ پرچے ان کے علاج کے لئے ہیں۔

اس کے برعکس اگر انسان اس ''مقام صبر'' کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہ کرے تو نفسانی خواہشات اسے پچھاڑ ڈالتی ہیں، اور وہ ان کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لئے اس سے زیادہ خطرناک بات کوئی نہیں ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اور اگر آدمی اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرے، اور مسلسل گناہوں میں ملوث ہوتا چلا جائے تو رفتہ رفتہ یہ سیاہی پورے دل کو گھیر لیتی ہے، اور جب آدمی اس مرحلے پر پہنچ جائے تو وہ گناہوں کا خوگر ہو جاتا ہے، اور ضمیر کی قوت اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ اسے کوئی گناہ محسوس نہیں کرتا۔

حسیات میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اگر کسی شفاف کپڑے پر کوئی دھبہ لگ جائے تو وہ ہر وقت نگاہوں میں کھٹکتا ہے اور اسے مٹانے کی فکر بھی پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر کپڑے پر بے شمار دھبے لگ جائیں تو ان کی وہ برائی دل میں باقی نہیں رہتی، اور انہیں مٹانے کی فکر بھی کم

ہو جاتی ہے۔

بس اسی طرح اگر دل پر لگنے والے پہلے داغ کو توبہ کے ذریعہ نہ دھویا گیا اور اس کے بعد ”صبر“ کے ذریعہ احتیاط نہ کی جائے تو پورا نفس داغ دار ہو جاتا ہے، اور اسی کو حدیث میں ”دل کے زنگ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی اصلاح کی لگن اور آخرت کی فکر دیتا ہے، انہیں ہر وقت اس بات کی طرف توجہ رہتی ہے کہ کہیں نفس ”صبر“ کا دامن چھوڑ کر گناہوں کا عادی نہ بن جائے، حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک مرتبہ ڈاک میں ایک لفافہ ایسا آیا کہ اس پر ٹکٹ تو لگا ہوا تھا مگر مہر نہ تھی، حضرت نے اسے چاک کر کے پھینک دیا، اور فرمایا کہ اگرچہ حکومت ہم سے بہت سارو پیہ ناجائز طریقوں سے وصول کرتی ہے اس لئے ہمیں فتوی کی رو سے یہ حق ہے کہ ہم اس طرح اپنا حق جس قدر ہو سکے وصول کر لیں، لیکن ان طریقوں کو اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ اس طرح نفس کو حیلے نکالنے کی بری عادت پڑتی ہے۔

مقام شکر

شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو!

''صبر'' کے بعد دوسرا مقام جس کی تحصیل فرض ہے ''مقام شکر'' کہلاتا ہے اگر آپ نے قرآن کریم پڑھا ہے تو اس میں بے شمار آیات دیکھی ہوں گی جن میں انسان کے ذمہ ''شکر'' کو واجب قرار دیا گیا ہے، آج کی مجلس میں مختصراً یہی بتلانا ہے کہ اس ''شکر'' سے کیا مراد ہے ؟اور اس مقام کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

''شکر'' کی حقیقت یہ ہے کہ محسن حقیقی کی نعمتوں کا اس طرح اقرار کرنا کہ اس سے دل میں محسن کی محبت اور اس کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو، گویا ''شکر'' کے تین لازمی عناصر ہیں۔

(۱) اس بات کا اقرار واعتراف کہ جتنی نعمتیں مجھے حاصل ہیں وہ سب کی سب اللہ کی طرف سے ہیں، اور اس نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمائی ہیں۔

(۲) چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنے فضل و کرم کی بارشیں برسا رکھی ہیں اس لئے کائنات میں میرے لئے اس سے بڑا محبوب کوئی نہیں ہونا چاہیئے۔

(۳) اللہ کے بے پایاں انعامات کا فطری تقاضا یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں اسی کی اطاعت کروں، اور اس کے مقابلے میں کسی کی اطاعت نہ کروں، بہ الفاظ دیگر جو نعمتیں اس نے مجھ کو عطا فرمائی ہیں، ان کو انہی کاموں میں خرچ کروں جو اس کی مرضی کے مطابق ہیں، اور ان کاموں میں خرچ کرنے سے بچوں جو اس کی مرضی کے خلاف ہیں۔

جب یہ تین جذبات کسی انسان کے دل میں پختہ ہو جاتے ہیں تو ''تصوف'' کی اصطلاح میں اسے کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے ''مقام شکر'' کو حاصل کر لیا ہے۔

پھر مقام شکر کو حاصل کرنے کے لئے ان تین جذبات میں سے بھی اصل الاصول پہلا ہی جذبہ ہے، کیونکہ اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال کما حقہ راسخ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے مجھ پر کتنی نعمتیں ہر آن مبذول رہتی ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالی سے محبت اور اطاعت کا جذبہ خود بخود بیدار ہوگا، لہٰذا اگر کسی وقت "محبت" اور "اطاعت" میں کوتاہی محسوس ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالی کی نعمتوں کا صحیح اقرار واعتراف دل میں پیدا نہیں ہوا۔

فرض کیجئے کہ ایک نامعلوم شخص ہے جو ہر مشکل کے وقت آپ کی مدد کرتا ہے جب کبھی آپ کو روپیہ پیسہ کی شدید ضرورت ہوتی ہے تو خود بخود کسی ذریعہ سے روپیہ پیسہ آپ کے پاس بھجوادیتا ہے، جب کبھی آپ بیمار پڑتے ہیں تو نہایت موثر دوائیں آپ کے لئے مہیا کرتا ہے، جب کبھی آپ بے روزگار ہوتے ہیں تو بہترین روزگار آپ کو دلوادیتا ہے، غرض ہر اس موقع پر نامعلوم طریقے سے آپ کی مدد کرتا ہے جب آپ پریشان یا خستہ حال ہوں۔ فطری بات ہے کہ آپ خواہ کتنے ہی سنگدل کیوں نہ ہوں اس شخص کی محبت آپ کے دل میں جاگزیں ہو جائے گی، اور اگر کسی موقع پر یہ شخص آپ سے کوئی کام کرنے کو کہے گا تو اس کی تعمیل میں آپ فخر اور مسرت محسوس کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر "محسن" کے احسانات کا علم اور اعتراف صحیح طریقے سے ہو تو اس کی محبت اور اطاعت خود بخود دل میں پیدا ہوتی ہے، لہٰذا "مقام شکر" کو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اللہ تعالٰی کے انعامات کا صحیح اقرار اور استحضار پیدا کیا جائے۔

عقیدۃً تو ہر صاحب مذہب اس بات کو مانتا ہے کہ تمام نعمتیں اللہ کی طرف سے آتی ہیں، لیکن "مقام شکر" تک پہنچنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ یہ حقیقت خیالات میں اتنی پیوست ہو جائے کہ آدمی کو ہر وقت یہ حقیقت سامنے کھڑی نظر آئے، مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس حقیقت کا استحضار اتنا قوی ہو کہ اسے اس کے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہ رہے، بلکہ وہ اس کا مشاہدہ کرے یہاں تک کہ تکلیفوں اور پریشانیوں کے وقت بھی وہ ان سیکڑوں نعمتوں کو فراموش نہ کرے جو عین اس وقت بھی اس پر مبذول ہیں۔

جب انسان کو مقام شکر حاصل نہیں ہوتا تو تکلیفوں اور پریشانیوں کے لئے اس کا احساس تیز اور نعمتوں اور راحتوں کے لئے نہایت سست ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیکڑوں نعمتوں اور راحتوں کے درمیان اگر اسے ذرا سی تکلیف پہنچ جائے تو وہ نعمتوں کو بھول کر اپنی ساری توجہات کا مرکز اس تکلیف کو بنالیتا ہے، اور اس کا غم لئے بیٹھا رہتا ہے، اس کے برعکس جس شخص کو "مقام شکر" حاصل ہو وہ چند در چند پریشانیوں میں بھی نعمتوں کا پلہ بھاری دیکھتا ہے، اور اسی وجہ سے اس حالت میں بھی اس کی زبان پر شکووں اور آہوں کے بجائے شکر ہی کے کلمات جاری رہتے ہیں۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر دیوبند میں حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں میرے نہایت شفیق استاذ اور مربی تھے، ایک مرتبہ انہیں شدید بخار آیا، میں مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا تو وہ چارپائی پر تقریباً مدہوش لیٹے ہوئے تھے، بخار اپنے شباب پر تھا، اور اس کی شدت کی وجہ سے غشی سی طاری تھی، وہ ذرا ہوش میں آئے تو میں نے سلام کر کے مزاج پوچھا انہوں نے بے ساختہ کہا:

الحمد للہ! الحمد للہ! بہت اچھا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ دل صحت مند ہے، گردے میں درد نہیں، سینے میں کوئی تکلیف نہیں سب اعضاء ٹھیک کام کر رہے ہیں بس بخار ہے!

یہ ہے "مقام شکر" کا نتیجہ کہ انسان شدید بخار میں مدہوش ہونے کی حالت میں بھی اس حقیقت کا استحضار رکھتا ہے کہ "تکلیف ایک ہے اور نعمتیں بے شمار" حقیقت بلا شبہ وہی ہے جو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی کہ بخار بے شک ایک تکلیف ہے، لیکن اس کے ساتھ نعمتیں کتنی موجود ہیں! دیکھنے کے لئے آنکھ، بولنے کے لئے زبان، سننے کے لئے کان، پکڑنے کے لئے ہاتھ، علاج کے لئے حکیم ڈاکٹر، تیمار داری کے لئے عزیز و قریب اور رشتہ دار، پھر تکلیف بھی صرف بخار ہے، دل، دماغ، سینہ، گردہ ہر چیز اپنی مخصوص بیماری سے محفوظ ہے، یہ حقیقت تو بیشک ہے، لیکن عام حالات میں انسان ایسے موقع پر ان تمام نعمتوں سے یکسر غافل ہو جاتا ہے، اور اسے بخار کی تکلیف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اس

حقیقت کا ادراک اور استحضار انہی لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں اللہ نے ’’مقام شکر‘‘ کی دولت نصیب فرمائی ہو۔

یہ دولت حاصل کس طرح ہوتی ہے؟ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کثرت کے ساتھ اللہ کی نعمتوں پر غور کیا کرے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں تفصیل کے ساتھ ان نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جن پر غور کرنے سے انسان ’’مقام شکر‘‘ حاصل کر سکتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نعمتیں دو قسم کی ہیں، ایک مخصوص نعمتیں جو کسی شخص کو انفرادی طور سے ملتی ہیں، فلاں شخص بہت بڑا عالم ہے، فلاں کے پاس اچھا مکان ہے، فلاں کو بڑی سعادت مند اولاد ملی ہوئی ہے، فلاں شخص بڑا ہر دلعزیز ہے، یہ ساری نعمتیں مخصوص نعمتیں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نعمتیں عام قسم کی ہیں، جو ہر انسان کو ہر وقت میسر ہیں، چاند، سورج، ستارے، ہوا، آگ، پانی، مٹی، جنگل، پہاڑ، پھر جسم کے اعضاء آنکھ، کان، ناک، ہاتھ پاؤں وغیرہ، اگر انسان ان تمام نعمتوں اور ان کی حکمتوں پر سنجیدگی سے غور کرے تو ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان کو ’’مقام شکر‘‘ حاصل نہ ہو، لیکن چونکہ یہ ساری نعمتیں بے مانگے اللہ نے دیدی ہیں، انہیں حاصل کرنے کے لئے کوئی محنت اٹھانی نہیں پڑی، کوئی پیسہ خرچ کرنا نہیں پڑا، اس لئے انسان انہیں نعمت یا تو سمجھتا ہی نہیں ہے یا سمجھتا ہے تو سرسری طور پر دیکھ کر گذر جاتا ہے، حالانکہ انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اگر کسی وقت ان میں سے ایک نعمت بھی چھن جائے تو کروڑ دو کروڑ روپیہ نہیں، ساری دنیا کے تمام خزانے لٹا کر بھی کیا وہ اس نعمت کو واپس لا سکتا ہے؟ قرآن کریم اسی طرف اشارہ فرماتا ہے:

﴿إن جعل الله عليكم الليل سرمدا إلى يوم القيامة من إله غير الله يأتيكم بضياء﴾

اگر اللہ تم پر قیامت کے دن تک دائمی رات مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کوئی معبود ہے جو تمہیں روشنی لا کر دے سکے؟

اسی طرح :

﴿إن جعل الله عليكم النهار سرمدا إلى يوم القيامة من إله
غير الله يأتيكم بليل تسكنون فيه﴾

اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی مسلط کردے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں ایسی رات لا کر دے سکے جس میں تمہیں سکون حاصل ہو۔

غرض انسان کو چاہئے کہ اولاً وہ ان مخصوص نعمتوں پر غور کرے جن سے بہت سے افراد محروم ہیں، پھر عام نعمتوں پر غور کرے جو ہر انسان کو میسر ہیں، مگر ان میں سے ہر ایک ایسی ہے کہ دنیا بھر کے عقلاء حکماء اور سائنسدان مل کر بھی چاہیں تو اس کو پیدا نہ کر سکیں، اگر وہ چھن جائے تو واپس نہ لا سکیں۔

اس معاملہ میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مختصر کتاب "الحکمۃ فی مخلوقات اللہ" بہت مفید ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی اسی نام سے شائع ہو چکا ہے، "مقام شکر" کو حاصل کرنے اور اللہ کی نعمتوں کا استحضار پیدا کرنے کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

مقام زہد

چیست دنیا؟ از خدا غافل شدن!

"زہد" کے لغوی معنی ہیں اپنی کسی مرغوب چیز کو کسی دوسری بہتر چیز کے لئے چھوڑ دینا، اسلامی اصطلاح میں زہد کا مطلب ہے آخرت کے لئے دنیا کو ترک کر دینا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ محض "ترک دنیا" کا نام "زہد" نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص بے حسی کی بنا پر دنیا کو چھوڑ دے تو یہ "زہد" نہیں کہلا سکتا۔

پھر آخرت کے لئے بھی جس "ترک دنیا" کی ترغیب دی گئی ہے اس کا مطلب سمجھنے میں بھی بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، بعض لوگ "زہد" کو "رہبانیت" کا مرادف سمجھنے لگتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ کھانا، پینا، تجارت یا کسب معاش کے ذرائع اختیار کرنا "زہد" کے خلاف ہے، حالانکہ اس قسم کی "ترک دنیا" قرآن و سنت کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

ہمیشہ یاد رکھئے کہ ایک تو ہیں دنیا کے مقاصد ضروریہ جن کے بغیر انسانی زندگی کا بقاء ممکن نہیں اور جنہیں حاصل کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے مثلاً بقدر ضرورت کھانا پینا اور حصول معاش کی کوشش ایسی چیزوں کو "حقوق نفس" کہا جاتا ہے، اور شریعت نے انسان کے ذمہ ضروری قرار دیا ہے کہ "نفس" کے ان "حقوق" کو ادا کیا جائے، اور انہی حقوق کو ترک کرنے کا نام "رھبانیت" ہے جس کی قرآن کریم نے ممانعت فرمائی ہے، اور حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

"طلب المعاش فريضة بعد الفريضة"

طلب معاش فرائض اسلام کے بعد دوسرا فریضہ ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی وجہ سے اپنے متوسلین کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنی "صحت" کا خاص خیال رکھا کریں، کیونکہ وہ حقوق نفس میں سے

ہے، اور اگر صحت خراب ہو جائے تو آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز ہے "حظوظ نفس" یعنی وہ نفسانی لذتیں جن پر نہ انسان کی بقاء موقوف ہے اور نہ ان کی تحصیل انسان کی فطرت میں داخل ہے، انسان انہیں محض اپنی زائد از ضرورت نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس قسم کی خواہشات کو ترک کرنے کا نام زہد ہے، اور یہ اسلام میں مطلوب و محبوب ہے۔ قرآن و حدیث یا فقہاء و صوفیاء کے کلام میں "ترک دنیا" سے مراد ہمیشہ "زہد" ہی ہوتا ہے، رہبانیت نہیں۔

صوفیاء کرام نے فرمایا ہے کہ زہد کے تین درجات ہیں۔

(۱) سب سے اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ مال و متاع سے دل میں ایسا اعراض اور نفرت ہو کہ کوئی بے مانگے بھی دی جائے تو اچھا نہ لگے، مگر اس نفرت کے باوجود اسے بقدر ضرورت استعمال کرے، اور ضروریات اصلیہ سے زائد حصے کو چھوڑ دے، یہ اعلیٰ مقام سرکار دو عالم ﷺ کا تھا، آپ نے فرمایا:

"مالي وللدنيا إنما أنا كمثل راكب استظل تحت شجرة ثم ارتحل" (أو كما قال)

مجھے دنیا سے کیا کام؟ میری مثال تو اس شہسوار کی سی ہے جو ذرا دیر کے لئے کسی درخت کی چھاؤں لیتا ہے، پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کا معمول کھانے پینے میں یہ تھا کہ بہت تھوڑی مقدار پر اکتفا فرماتے تھے۔ شمائل ترمذی کی متعدد روایات سے ثابت ہے کہ آپ نے کبھی "سیر" ہو کر کھانا تناول نہیں فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ہم مہینوں تک صرف پانی اور کھجور پر اکتفا کرتے تھے۔

(۲) زہد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی نہ دنیوی مال و متاع سے بالکل نفرت کرتا ہو، اور نہ اس کی کوئی خاص رغبت ہو کوئی زائد از ضرورت چیز بھی مل گئی تو اللہ کا شکر کر کے استعمال کی، اور اگر کچھ نہ ملا تو بھی چنداں رنج و افسوس نہ ہوا۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں ان کا سارا مال چوری ہو گیا، چوروں نے ان کے گھر میں بالکل جھاڑو ہی دیدی ایک چیز نہ چھوڑی، حضرت کو پتہ چلا تو چنداں ملال کا اظہار نہ فرمایا بلکہ ایک خاص کیفیت میں یہ مصرعہ پڑھا ؎

ماهیچ نه داریم وغم هیچ نه داریم

اتفاق سے متوسلین کی کوشش سے وہ مال مسروقہ دوبارہ مل گیا تو اس پر بھی مسرت کا اظہار فرمایا اور اسے استعمال کیا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی قسم کا واقعہ منقول ہے۔

(۳) زہد کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی کو دنیا کی طرف رغبت تو ہو، مگر اس کی فکر میں زیادہ نہ پڑے، اسی وجہ سے دنیا کی محبت اسے اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی یہ درجہ "قناعت" بھی کہلاتا ہے، اسی کو حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا، از خدا غافل شدن

نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

یعنی سونا چاندی اور بیوی بچے دنیا نہیں، دنیا یہ ہے کہ آدمی کی توجہات اور فکری و عملی توانائیوں کا سارا مرکز یہ چیزیں بن جائیں، اور وہ خدا سے غافل ہو جائے، لہذا اگر کوئی شخص مالدار ہے، مگر اس کی دولت اسے اللہ سے غافل نہیں کرتی تو یہ "دنیا" نہیں، اور اگر کسی کے پاس چار ہی پیسے ہیں، مگر انہیں میں اس کا دل الجھا ہوا ہے تو یہ "دنیا" ہے، اور مذموم ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ بہت بڑے تاجر تھے، ایک شخص ان کی بزرگی کا شہرہ سن کر ان کے پاس بڑی عقیدت کے ساتھ بیعت ہونے کے لئے پہنچا، مگر دیکھا کہ ان کے اوقات کا بڑا حصہ تجارت اور کاروبار میں صرف ہوتا ہے، اس کے دل میں شبہ پیدا ہوا اور اس نے ان بزرگ سے کہا کہ "حضرت! کیا یہ اتنا بڑا کاروبار زہد کے منافی نہیں؟" بزرگ نے اس وقت کوئی جواب نہ دیا، پھر ایک دن تفریح کے لئے وہ اپنے مرید کو لے کر آبادی سے دور نکل گئے، وہیں انہوں نے اچانک مرید سے کہا کہ "بھائی! حج کرنے کو دل چاہ رہا ہے" مرید

نے کہا "حضرت! دل تو میرا بھی چاہتا ہے" بزرگ نے کہا "پھر چلو!" اور یہ کہہ کر مکہ مکرمہ کی سمت چل پڑے، مرید نے کہا "حضرت! میری ایک چادر شہر میں رہ گئی ہے، ذرا وہ لے آؤں" اس پر بزرگ نے فرمایا "تمہیں اپنی چادر کی تو بڑی فکر ہوئی، مگر یہ نہ دیکھا کہ ہمارا کاروبار کس قدر پھیلا پڑا ہے، مرید کو اس موقع پر تنبہ ہوا اور اس نے کہا کہ بات سمجھ میں آگئی۔"

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نہایت دلنشین مثال سے اس کو سمجھایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ انسان کی مثال کشتی کی سی ہے، اور دنیا کی مثال پانی کی سی ہے، کشتی کے لئے پانی اس قدر ناگزیر ہے کہ کشتی اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی، اور جب تک پانی کشتی کے ارد گرد رہے اس کے لئے رحمت ہے، لیکن اگر یہی پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو وہی کشتی کی تباہی کا سامان بن جاتا ہے، بالکل یہی حال دنیا کا ہے کہ جب تک وہ انسان کے ارد گرد رہے تو اس کے لئے رحمت ہے، لیکن اگر انسان کے دل میں داخل ہو جائے تو یہی دنیا انسان کو تباہ کر ڈالتی ہے۔

آب اند زیر کشتی پستی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

حقیقت یہ ہے کہ اس حکیمانہ مثال سے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے "دنیا" کی حقیقت اس طرح واضح فرمادی ہے کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا، بس "زہد" کی روح یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ کے سوا ہر چیز سے خالی ہو، خواہ وہ بیوی بچوں کے عین درمیان رہے، کسب معاش کی کوششیں بھی کرے، کھائے اور پیئے بھی، آرام اور تفریح بھی کرے، لیکن ان میں سے کسی چیز کی محبت کو اپنے دل پر غالب نہ ہونے دے، اور اسے یاد خدا کے لئے مخصوص رکھے، اکبر نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ کہاں کا فسانہ سود و زیاں — جو گیا سو گیا، جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصت عمر ہے کم — جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

ہمارے حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ رماتے ہیں۔

دنیا میں ہوں، دنیا کا — طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں — خریدار نہیں ہوں

اس زمانے میں ''زہد'' کے پہلے دو درجات کو حاصل کرنا مشکل ہے، اور اگر فقر و فاقہ حد سے گذر جائے تو موجودہ حالات میں گناہوں کا سبب بھی بن سکتا ہے، اس لئے محقق صوفیاء کا کہنا ہے کہ اس دور میں تیسرے درجے کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے متوسلین سے فرمایا کرتے تھے کہ تم سب کے بدلے فقر و فاقہ میں نے کرلیا ہے، تمہارا زہد یہ ہے کہ حلال راستوں سے معاش حاصل کرو، اور خدا کی یاد سے غافل نہ ہو۔

مقام توحید

یکے داں، یکے خواں، یکے بین، یکے جو

جن اعمال باطنہ کو حاصل کرنا انسان کے ذمہ ضروری ہے ان میں سے ایک توحید ہے، ''توحید'' کا ایک مفہوم تو آپ نے علم عقائد میں پڑھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کو ایک مانے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے یہ توحید اعتقادی ہے، جس پر انسان کا ایمان موقوف ہے، اور اس کے بغیر انسان مسلمان ہی نہیں ہو سکتا...... لیکن علم تصوف میں ''توحید'' سے مراد ''توحید عملی'' ہوتی ہے جو توحید اعتقادی سے اگلا درجہ ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ''توحید اعتقادی'' میں جس عقیدے کو عملی طور پر حاصل کیا گیا تھا، اسے عملی طور پر اپنا ''حال'' بنالیا جائے، یعنی ہر آن اس حقیقت کو نگاہوں کے سامنے رکھا جائے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صرف اللہ کی ذات واحد سے ہو رہا ہے، اس دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں وہ سب اللہ ہی کی طرف سے آتے ہیں، اور اس کی مشیت کے بغیر کوئی ذرہ ادھر سے ادھر حرکت نہیں کر سکتا، عقیدے کی حد تک تو اس بات کو ہر مسلمان جانتا اور مانتا ہے، لیکن ہر رنج و راحت اور غم و مسرت کے وقت اس حقیقت کا استحضار نہیں رہتا، اس لئے جب کسی ظاہری ذریعے سے کوئی خوشی یا تکلیف پہنچتی ہے تو آدمی اسی ظاہری ذریعہ کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، اور خوشی اور تکلیف دونوں کی نسبت اسی کی طرف کرتا ہے، لیکن ''توحید عملی'' کا مطالبہ انسان سے یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ہر آن اس طرح مستحضر رکھے گویا اس کو دیکھ رہا ہے، اسی کو بعض بزرگوں نے اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ:

توحید خدا واحد دیدن بود، نہ واحد گفتن۔

جب انسان کائنات کے ہر واقعے کے پیچھے ہر آن خدائے واحد ہی کو دیکھتا ہے تو وہ

لوگوں کی دشمنی اور دوستی سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ جو راحت یا تکلیف اسے پہنچی ہے وہ تمام تر خدا ہی کی طرف سے ہے، اور جو انسان ظاہری طور پر اس کا سبب نظر آرہا ہے وہ محض ایک واسطہ ہے، اس سے زائد کچھ نہیں ؎

از خدا داں خلاف دشمن و دوست

کہ دل ہر دو در تصرف اوست

سرکار دو عالم ﷺ سے منقول ہے کہ جب آپ کے سامنے کوئی ناگوار طبع بات پیش آتی تو زیادہ غم وغصہ کا اظہار فرمانے کے بجائے صرف اتنا فرمایا کرتے تھے کہ :

"ماشاء اللہ کان و مالم یشأ لا یکون"

جو کچھ اللہ نے چاہا وہ ہو گیا، اور جو کچھ وہ نہیں چاہے گا وہ نہیں ہو گا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ رنج وتکلیف کے موقع پر تسکین قلب کا اس سے بہتر نسخہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تمثیل کے ذریعے اس بات کو سمجھایا ہے، فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے تلوار پر دعویٰ کیا کہ تو نے مجھے مارا ہے، اس نے جواب میں کہا کہ میں کون ہوں! مجھ میں کیا طاقت تھی؟ مجھے تو ہاتھ نے استعمال کیا، دعویٰ کرنا ہے تو اس پر کرو، اس شخص نے ہاتھ پر دعویٰ کیا تو اس نے کہا کہ میرا کیا قصور؟ میں تو بے حس و بے شعور تھا، یہ "ارادہ" تھا جس نے آکر مجھے جگایا اس لئے لڑنا ہے تو اس سے لڑو، اس نے "ارادہ" پر دعویٰ کیا تو اس نے کہا میں کیا چیز ہوں؟ مجھے تو دل نے اس حرکت پر برانگیختہ کیا تھا، دل کے پاس پہنچا تو وہ بولا کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میں تو کسی اور کے قبضہ قدرت میں ہوں، القلوب بین اصبعی الرحمن! اس طرح انجام کار تمام حرکات کی انتہا ایک ہی فاعل حقیقی پر ہوتی ہے اور وہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ۔

بس یہی وہ حقیقت ہے جس کا استحضار "توحید عملی" کو مطلوب ہے، اور جب انسان توحید کے اس مقام کو بدرجہ اتم حاصل کر لیتا ہے تو نہ اس کے دل میں کسی کی خوشامد کا جذبہ پیدا

ہوتا ہے، نہ وہ چاپلوسی کرتا ہے، نہ وہ خدا کے سوا کسی سے ڈرتا ہے، نہ مال و دولت کی لالچ اسے کسی کام پر آمادہ کرسکتی ہے، اور نہ جان کا خوف، اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

موحد! چہ برپائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نہ باشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید وبس

اس لئے کہ وہ اس حقیقت کو صرف جانتا ہی نہیں کھلی آنکھوں دیکھتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان مل کر مجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے، اور سارے جہاں کی مخلوقات جمع ہو کر مجھے کوئی زک دینا چاہیں تو نہیں دے سکتیں، اس لئے میں کسی سے کیوں ڈروں؟ اور کسی خوشامد کسی لالچ کا شکار کیوں ہوں؟ چنانچہ وہ اللہ کے سوا نہ کسی سے ڈرتا ہے نہ کسی کے سامنے جھکتا ہے نہ کسی کی خوشامد کرتا ہے، نہ کسی سے کوئی ایسی امید باندھتا ہے جس کی خلاف ورزی سے اسے تکلیف پہنچے، بس وہ تو ایک ہی ذات کے ساتھ تعلق میں مست ہے، اور اس کا نعرہ یہ ہے کہ ؎

یکے داں، یکے خواں، یکے بیں، یکے جو

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقام حاصل کیسے ہو؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اعتقاداً توحید کا یقین تو ہوتا ہے، لیکن چونکہ انسان کی نگاہیں ظاہری وسائط کے خم وپیچ میں الجھی رہتی ہیں، اس لئے اس یقین پر کچھ اوہام مسلط ہوتے رہتے ہیں، اس کی مثال بقول امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایسی ہے جیسے ایک مردہ انسان کی لاش کے بارے میں ہر انسا کو مکمل یقین ہوتا ہے کہ یہ جماد ہے، اس میں کوئی شعور نہیں، یہ از خود حرکت نہیں کرسکتی، لیکن اس یقین کے باوجود انسان اس لاش کے ساتھ ایک ہی بستر پر سونے سے وحشت محسوس کرتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لاش کے بے جان ہونے کا قائل نہیں بلا شبہ اسکے بے جان ہونے کا قائل ہے، لیکن کچھ اوہام اس کے ذہن کو پریشان کرتے ہیں۔

بس اسی طرح ہر مسلمان ان ظاہری وسائط کو بے بس تو سمجھتا ہے مگر اس کے قلب میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ اوہام کو اپنے اوپر غالب نہ ہونے دے، اگر قلب میں یہ قوت پیدا ہو جائے تو "توحید عملی" کا مقام خود بخود حاصل ہو جائے گا، حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

کچھ بھی مجنوں! جو بصیرت تجھے حاصل ہو جائے
تو نے لیلیٰ جسے سمجھا ہے وہ محمل ہو جائے

قلب کی یہ قوت "مراقبات" کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، جب انسان یکسوئی کے ساتھ روزانہ واقعات عالم پر نظر کرتا ہے، اور یہ دیکھتا ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے منصوبے کس طرح روزانہ خاک میں مل جاتے ہیں، تو رفتہ رفتہ اس کے دل سے اوہام کے بادل چھٹنے لگتے ہیں، اور "عقیدہ توحید" اس کی رگ وپے میں سرایت کر کے اس کا "حال" بننے لگتا ہے، ہاں! ان مراقبات میں کسی شیخ کامل کی رہنمائی کی ضرورت ہے، تاکہ وہ انسان کو افراط و تفریط میں مبتلا ہونے سے روکتا رہے۔

افراط و تفریط کے سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں، ایک تو یہ کہ اگرچہ اس کائنات میں ہر خیر و شر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اور انسان کو راحت بھی اسی کی طرف سے پہنچتی ہے، اور تکلیف بھی، لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خیر کے جزئیات کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی طرف کرے، لیکن شر کے جزئیات کی نسبت اس کی طرف نہ کرے، قرآن عزیز کا ارشاد ہے کہ :

﴿ما يفتح الله للناس من رحمة فلا ممسك لها، وما يمسك فلا مرسل له من بعده﴾

اللہ جس رحمت کو کھول دے تو اسے بند کرنے والا کوئی نہیں، اور جس چیز کو بند کر دے اسے اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں۔

یہاں باری تعالیٰ نے کھولنے کے ساتھ تو "رحمت" کا ذکر فرمایا ہے مگر بند کرنے کے ساتھ "رحمت" کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ وہاں "جس چیز" کے الفاظ ہیں اس "چیز" کی تشریح

نہیں فرمائی، اس میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ رحمت کو بند کرنے کی نسبت اللہ کی طرف کرنا خلاف ادب ہے، اور اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ جو چیز بہ ظاہر خلاف رحمت نظر آتی ہے، وہ بھی کائنات کے تکوینی مصالح کے پیش نظر رحمت ہی ہوتی ہے۔

اسی طریقے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار فرمایا قرآن کریم میں ہے کہ وہ تمام اچھی چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف کرتے رہے کہ وہ مجھے ہدایت دیتا ہے، مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور اس کے بعد فرمایا کہ :

﴿وإذا مرضت فهو يشفين﴾

اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔

یہاں شفا دینے کی نسبت اللہ کی طرف فرمائی، اور مرض کی نسبت خود اپنی طرف کی۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے ایک جگہ فرمایا کہ

﴿فاردنا ان يبدلهما ربهما خيرا منه زكوة وأقرب رحما﴾

یہاں اچھی بات کے ارادے کی نسبت اللہ کی طرف فرمائی لیکن کشتی کے قصے میں فرمایا ﴿فأردت أن اعيبها﴾ یہاں چونکہ "عیب" کا لفظ آ گیا تھا، اس لئے اس کی نسبت خود اپنی طرف فرمائی۔

اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالی کے لئے صرف ﴿خالق الكلاب والخنازير﴾ کے الفاظ استعمال کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ کائنات کے تمام واقعات میں فاعل و موثر حقیقی اللہ ہی کی ذات ہے لیکن اسلامی شریعت نے ظاہری وسائط کو دنیوی احکام میں بالکل خارج از بحث قرار نہیں دیا، بلکہ ان کے بھی کچھ حقوق رکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ فاعل حقیقی تو بلا شبہ اللہ ہی ہے لیکن اللہ نے جس چیز کو فعل کے وقوع کے لئے واسطہ بنایا اس کا بھی ایک مقام ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص آپ پر کوئی احسان کرے تو اس کا شکر ادا کرنا بھی آپ پر واجب ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے علماء نے لکھا ہے کہ حصول علم کے جو آلات ہوتے ہیں مثلاً، قلم دوات

اور کاغذ وغیرہ، طالب علم کو ان کا بھی احترام کرنا چاہئے۔

البتہ ان وسائط کو کس حد تک ملحوظ رکھا جائے اور کہاں ان سے صرف نظر کر لیا جائے؟ یہی ایک فرق ہے جو "توحید عملی" کی راہ پر چلنے والے کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اور عملاً اس کی حدود کا تعین کسی شیخ کامل کی رہنمائی ہی سے ہو سکتا ہے۔

مقام توکل

بر توَکل پایہ اشتر بہ بند

جن باطنی اعمال کو حاصل کرنا انسان کے ذمہ ضروری ہے ان میں سے ایک ''توکل'' ہے جو در حقیقت اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان '' مقام توحید'' کو حاصل کر چکا ہو، قرآن وحدیث میں توکل کی تاکید بار بار آئی ہے، اور جگہ جگہ اس کے فضائل وفوائد بیان کئے گئے ہیں، آج کی مجلس میں اسی کی حقیقت بیان کرنا مقصود ہے۔

''توکل ''عربی زبان کا لفظ ہے جو'' وکالۃ '' سے ماخوذ ہے، اس کے لغوی معنی ہیں ,,کسی پر بھروسہ کرکے کسی کام کو اس کے سپرد کردینا،، پھر اسلامی اصطلاح میں توکل اسے کہتے ہیں کہ انسان اسباب پر تکیہ کرنے کے بجائے اللہ پر مکمل بھروسہ کرکے اپنے تمام امور اسی کو سونپ دے۔

غور فرمایئے ! کہ آپ کسی شخص پر کب بھروسہ کرتے ہیں جس شخص کو آپ بھروسہ کا اہل سمجھتے ہوں، اس میں کیا صفات آپ دیکھنا چاہتے ہیں ؟ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان بھروسہ کا اہل اسوقت ہوتا ہے جب اس میں تین چیزیں پائی جاتی ہوں، علم، قدرت اور ہمدردی وشفقت!

یعنی اول تو آپ اس بات کا اطمینان کرنا چاہیں گے کہ جس شخص پر آپ بھروسہ کررہے ہیں وہ آپ سے آپ کے احوال سے اور تمام متعلقہ امور سے پوری واقفیت رکھتا ہو ورنہ ظاہر ہے کہ وہ آپ کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

دوسرے آپ یہ چاہیں گے کہ جو کام آپ اس کے سپرد کررہے ہیں وہ اسے انجام دینے کی پوری صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر وہ اس معاملے میں بے بس ہوا تو آپ کی کیا مدد کر سکے گا؟

تیسرے آپ کی خواہش یہ ہوگی کہ جس شخص پر آپ نے بھروسہ کیا ہے وہ آپ کا

ہمدرد اور آپ پر مہربان ہو، ورنہ اس کی وسیع معلومات اور عمدہ صلاحیتیں آپ کے کچھ کام نہ آسکیں گی۔

اس کے بعد ذرا اپنے گردوپیش پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے، کیا کوئی انسان ایسا نظر آتا ہے جس میں یہ تینوں صفات مکمل طور سے موجود ہوں اور زندگی کے ہر معاملے میں آپ اس کے علم، قدرت اور شفقت پر بھروسہ کر سکتے ہوں! اگر آپ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں گے تو یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا، ایسا کوئی شخص آپ کو ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکے گا جس میں یہ تینوں اوصاف اس قدر کمال کے ساتھ موجود ہوں کہ آپ اپنی زندگی کا ہر معاملہ اسے سونپ کر بالکل مطمئن ہو سکیں۔

اب اللہ جل شانہ کے معاملے پر غور فرمائیے تو نظر آئے گا کہ اس میں یہ تینوں اوصاف اس قدر کمال کے ساتھ موجود ہیں کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لہذا کیا وہ ذات اس لائق نہیں ہے کہ انسان اپنی زندگی کا ہر معاملہ اسے سونپ کر مطمئن ہو جائے، اور ہر معاملہ میں بس اسی پر بھروسہ کرے یقیناً ہے!

اس لئے قرآن کریم فرماتا ہے :

﴿وعلى الله فليتوكل المؤمنون﴾ اور مومن بس اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

توکل کی تین قسمیں

چونکہ توکل کا صحیح مفہوم سمجھنے میں لوگ عموماً غلطیاں کرتے ہیں، اس لئے یہ سمجھ لیجئے کہ اس کی تین قسمیں ہیں :

(۱) توکل کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان نظری طور سے تو اپنا معاملہ اللہ ہی کے سپرد کر رکھے، لیکن عملی طور پر اس کا دھیان اسباب ہی کی طرف لگا رہے، اور ظاہری اسباب ووسائل ہی اسکی بیشتر توجہات کا مرکز بنے رہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ اپنا مقدمہ کسی وکیل کو سپرد کر دیتے ہیں، اس پر آپ کو بھروسہ تو ہوتا ہے، لیکن معاملہ اس کے سپرد کر کے

آپ بالکل فارغ نہیں ہو جاتے، بلکہ ہر وقت دھیان اور کوشش اس کی طرف لگی رہتی ہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ آپ ظاہری اسباب کو معمولی طور سے صرف اس لئے اختیار کریں کہ اللہ تعالی نے انہیں اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اس کے بعد معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیں، اور یہ بات ہر آن مستحضر رکھیں کہ یہ ظاہری اسباب کوئی حقیقت نہیں رکھتے، کرنے والا اللہ ہی ہے، چنانچہ آپ کی بیشتر توجہات اللہ ہی کو پکارنے اور اسی کے سامنے اپنے حاجتیں بیان کرنے میں صرف ہوں اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بچے کو جب کبھی کوئی ضرورت پیش آتی ہے وہ بس اپنی ماں ہی کو پکارتا ہے، خود کچھ ہاتھ پاؤں مارے بھی تو اس پر مطمئن نہیں ہوتا، اس کی توجہ اسی کی طرف رہتی ہے کہ کسی طرح ماں متوجہ ہو جائے تو وہ ہر مشکل کو حل کر دے گی۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالی پر اس درجہ بھروسہ کیا جائے کہ ظاہری اسباب کی طرف مطلق نظر نہ ہو، یہاں تک کہ اللہ کو پکارے بھی نہیں، اور یہ سمجھے کہ وہ تو خود میرے دکھ درد کو جانتا ہے وہ خود ہی مداوا کرے گا۔

ایک روایت ہے کہ جب نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال رہا تھا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور پوچھا کہ اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں، حضرت خلیل اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"أما إليك فلا، وأما الله فهو يعلم مابی"

تمہاری تو مجھے احتیاج نہیں، ہاں اللہ کی طرف محتاج ہوں، مگر وہ میرے حال کو خوب جانتا ہے۔

توکل کے ان تین درجات میں سے پہلا درجہ تو عامیانہ توکل ہے جو توکل کا بالکل ادنی درجہ ہے، اور تیسرا درجہ توکل کی حقیقت کے اعتبار سے تو بہت اعلی ہے، مگر یہ انبیاء و صلحاء کے خاص احوال سے متعلق ہے، دائمی طرز عمل کے لئے شریعت میں مطلوب نہیں ہے۔

شریعت میں مطلوب توکل کا دوسرا درجہ ہے، آنحضرت ﷺ نے سنت اسی کو قرار

دیا ہے، کہ ظاہری اسباب کو معمولی طور سے اختیار کرو، اللہ سے دعائیں بھی کرو، لیکن بھروسہ ان ظاہری اسباب پر کرنے کے بجائے اللہ ہی پر رکھو۔

توکل اور ترک اسباب

بر توکل پایہ اشتر بہ بند

بعض ناواقف لوگوں نے ”توکل“ کو بہت غلط استعمال کیا، انہوں نے اسباب کو بالکل ترک کر دینے کا نام توکل رکھا ہے، بعض صوفیاء نے اپنے کچھ اقوال یا اشعار میں ترک اسباب کو قابل تعریف قرار دیا ہے، یہ لوگ اس سے استدلال کرتے ہیں، حالانکہ ان کا منشا یہ تھا کہ ظاہری اسباب کی حقیقت ہر آن پیش نظر رکھو کہ حقیقت میں نہ وہ کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ نفع وضرور تمام تر اللہ ہی کے قبضے میں ہے، ان کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ظاہری اسباب کو بالکل چھوڑ دو۔

یہاں ”ترک سبب“ کے مسئلے کی تھوڑی سی تفصیل عرض کر دینا مناسب ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں جتنے کام کرتا ہے اس سے یا جلب منفعت (نفع حاصل کرنا) مقصود ہوتا ہے، یا حفظ منفعت (حاصل شدہ نفع کی حفاظت) یا دفع مضرت (کسی نقصان کو ختم کرنا) تین کاموں کے لئے ساری دنیا دن رات سرگرداں ہے، اللہ تعالی نے ان میں سے ہر ایک کام کے لئے کچھ اسباب بنائے ہیں، ان اسباب کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) یقینی اسباب

یعنی ایسے اسباب جن کے ذریعہ مسبب کا حصول یقینی ہوتا ہے، مثلاً بھوک لگ رہی ہے، روٹی سامنے رکھی ہے، یقین ہے کہ اس کے کھالینے سے بھوک رفع ہو جائے گی، ایسے اسباب کو چھوڑ دینا توکل نہیں جنون ہے، اور شرعاً حرام ہے۔

(۲) ظنی اسباب

یعنی ایسے اسباب جن کو اختیار کرنے سے مسبب کا حصول پوری طرح یقینی تو نہیں

ہے، لیکن عادۃً ہو جایا کرتا ہے، مثلاً تجارت، زراعت وغیرہ کے ذریعہ معاش کا حصول، ایسے اسباب کو ترک کرنے کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ نہ سبب کو اختیار کرے، نہ اسباب کے ماحول میں رہے، مثلاً کوئی شخص جاکر جنگل میں بیٹھ جائے، یہ تو شرعاً ناجائز ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اسباب کے ماحول میں رہ کر اسباب کو چھوڑ دے، مثلاً شہروں میں لوگوں کے ساتھ رہے، لیکن کسب معاش کی فکر نہ کرے، عام حالات میں تو یہ بھی جائز نہیں، لیکن چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

(الف) صاحب عیال نہ ہو، یعنی کسی کا نان و نفقہ شرعاً اس کے ذمہ نہ ہو۔

(ب) صاحب عزم اور پختہ کار ہو۔

(ج) ہر حال میں راضی برضا رہے۔

(د) کسی سے صراحۃً یا اشارۃً سوال نہ کرے۔

ان شرائط کے ساتھ کوئی شخص علاجاً اسباب معاش کو ترک کرے تو شرعاً جائز ہوگا، لیکن ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہوگئی تو ناجائز ہو جائے گا۔ جن صوفیاء کرام سے منقول ہے کہ وہ اسباب معاش کو ترک کرکے بیٹھ گئے تھے ان کا حال یہی تھا کہ وہ واقعتاً راضی برضا تھے، اولوالعزم اور پختہ کار تھے، کسی دیکھنے والے کو گمان ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ فاقہ سے ہیں، یا انہیں روپے پیسے کی کوئی ضرورت ہے، قرآن کریم نے اصحاب صفہ کی یہی شان بیان فرمائی ہے کہ:

﴿یحسبهم الجاهل أغنیاء من التعفف﴾ (البقرۃ)

ناواقف آدمی ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے انہیں مالدار سمجھتا ہے۔

پھر یہاں یہ بھی یاد رکھئے کہ جن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم یا صوفیاء کرام سے اسباب معاش کو ترک کرنا منقول ہے وہ کسی دینی یا اجتماعی ضرورت یا علاج نفس کے لئے تھا، ورنہ عام حالات میں افضل بہر صورت یہی ہے کہ انسان کسب معاش کرے، اور یہ توکل کے کسی طرح منافی نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اونچے درجے کے

عارفین کا توکل یہی ہے کہ وہ کسب معاش کر کے نظر اللہ کے سوا کسی اور پر نہیں رکھتے۔

انوار سہیلی فارسی کی مشہور کتاب ہے، اس میں ایک بڑی حکیمانہ حکایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے ایک کوے کو دیکھا کہ اس کے پر کٹے ہوئے ہیں وہ دل میں سوچنے لگا کہ یہ بیچارہ کیسے زندہ رہیگا؟ اسکے لئے خوراک کیسے مہیا ہو گی؟ ابھی کچھ ہی دیر گذری تھی کہ ایک عقاب نظر آیا جو اپنی چونچ میں ایک شکار پکڑ کر لایا تھا، یہ عقاب کوے کے قریب پہنچا اور کوے کے منہ میں شکار ڈال گیا، اس شخص نے جب یہ دیکھا تو خیال آیا کہ اللہ تعالی اپنی مخلوقات کو اس طرح بھی رزق دیتا ہے، پھر میں تلاش معاش کی فکر کیوں کروں، اللہ تعالی خود میرے لئے رزق بھیجے گا، چنانچہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا، کئی روز گذر گئے مگر اسے کچھ نہ ملا، پھر کسی حکیم نے اسے سمجھایا کہ بندۂ خدا تجھے دو پرندے دکھلائے گئے تھے، ایک پر کٹا کوا، دوسرے عقاب، تو نے کوا بننے کو ترجیح کیوں دی؟ عقاب بننے کا خیال کیوں نہ آیا؟ جو خود بھی کھاتا ہے اور دوسرے معذوروں کو بھی کھلاتا ہے۔

یہ حکایت توکل کی حقیقت کی بالکل ٹھیک نشان دہی کرتی ہے جس شخص کے پاس اسباب ووسائل موجود ہوں اس کا اسباب کا چھوڑ دینا غلط ہے، اس کی مثال عقاب کی سی ہے، اسے خود بھی کھانا چاہئے، دوسروں کو بھی کھلانا چاہئے، ہاں اگر کوئی شخص معذوری یا مجبوری سے اسباب سے محروم ہو جائے تو پھر یہ غیر معمولی فکر بھی غلط ہے کہ روزی کہاں سے آئے گی؟ ان کو ہر آن یہ سوچنا چاہئے کہ اسباب ووسائل تو چند آلات تھے، اصل رزاق تو اللہ ہے، اگر اسے زندہ رکھنا منظور ہے تو وہ کوئی نہ کوئی انتظام کرے گا۔

چنانچہ صوفیا کرام نے اس مسئلے پر گفتگو کی ہے کہ جن صورتوں میں انسان کے لئے ترک سبب جائز ہوتا ہے ان صورتوں میں بھی اسباب عادیہ کو ترک کر کے توکل کرنا بہتر ہے، یا اسباب عادیہ کو اختیار کر کے؟ شیخ عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسباب کو اختیار کرنے پر زبان طعن دراز کرے وہ اللہ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے، اور جو شخص (جائز مواقع پر) اسباب عادیہ کو ترک کرنے پر اعتراض کرتا ہے وہ توحید کی حقیقت کا

انکار کرتا ہے، لہٰذا ایسے موقع پر جائز تو دونوں ہیں، لیکن افضل واعلیٰ طریقہ وہی ہے جس کی تعلیم انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دی ہے، اور جو ان حضرات کی سنت ہے، اور وہ یہ کہ اسباب کو اختیار بھی کیا جائے، لیکن بھروسہ تمام تر اللہ پر ہو، اسباب کو کارساز نہ سمجھا جائے، آں حضرت ﷺ نے **"اعقل ساقھا و توکل"** کے سادہ مختصر اور بلیغ جملے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

عصر حاضر میں خاص طور سے "توکل" کا صحیح طریقہ یہی ہے کیونکہ جن مواقع پر ترک اسباب جائز ہوتا ہے وہاں بھی اسباب کو چھوڑنے سے آج کل سینکڑوں مفاسد اور غوائل کا خطرہ ہے، اور یہ چیز کم از کم کبر تو پیدا کر ہی دیتی ہے۔

(۳) اسباب خفیہ

ہاں اسباب کی ایک قسم اور ہے جسے اسباب خفیہ کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اور وہ ہے دور از کار اور باریک تدبیروں کے پیچھے پڑنا، یہ چیز بلاشبہ "توکل" کے منافی ہے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جس مقصد کو بھی حاصل کرنا ہو، اس کے لئے سامنے کے ان ظاہری اسباب کو تو ضرور اختیار کیا جائے جو انسان کے بس میں ہوں، قلب و دماغ کو لمبی چوڑی تدبیروں کی فکر سے آزاد رکھا جائے۔

حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اسی بات کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ :

"اجملوا فی الطلب و توکلوا علیه"

کسی چیز کو طلب کرنے میں اختصار سے کام لو، اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ان افراد کا ذکر فرمایا ہے جو بے حساب جنت میں داخل ہوں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو :

"لایکتوون"

داغ دینے کا علاج نہیں کرتے۔

اس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ باریک تدبیروں کے پیچھے لگنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ اہل عرب میں لوہے کے ذریعہ داغ دینے کا علاج آخری علاج سمجھا جاتا تھا، مقولہ مشہور ہے کہ :"آخر الدواء الكي" (آخری دوا داغ دینا ہے) خود آنحضرت ﷺ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ سامنے کے اسباب اور تدبیروں کو اختیار فرماتے، اور اس کے بعد یہ دعا فرماتے کہ "اللهم هذا الجهد وعليك التكلان" (اے اللہ یہ اپنی سی کوشش تھی اور بھروسہ آپ ہی پر ہے)

۱۸۵۷ء کے جہاد میں دہلی کے چند بزرگ ایک مکان میں محصور ہو گئے، باہر قتل عام ہو رہا تھا اس لئے نکلنا ممکن نہ تھا پانی کا جتنا ذخیرہ مکان کے اندر موجود تھا وہ دو تین روز میں ختم ہو گیا، جب پیاس سے عاجز ہو گئے تو ایک بزرگ نے پیالہ لے کر پرنالے کے نیچے رکھ دیا، اور دعا کی کہ یا اللہ! میرے بس کا تو اتنا ہی کام تھا، آگے بارش برسانا آپ کا کام ہے، چنانچہ اللہ کے فضل و کرم سے بارش ہوئی اور سب لوگ سیراب ہوئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک اسباب کو بالکل چھوڑ بیٹھنا غلط ہے، لیکن توکل کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو اسباب کی حقیقت ہر آن ذہن میں مستحضر رہے، اور کسی بھی مرحلے پر ظاہری اسباب پر بھروسہ نہ کیا جائے، اس کے بجائے اختصار اور اعتدال کے ساتھ اسباب کو اختیار کر کے معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔

البتہ افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کے اس راستہ کو اختیار کرنا بہت مشکل کام ہے، اور عادۃً کسی شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر اس مقام کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس لئے "مقام توکل" کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ کسی شیخ کامل سے رجوع کر کے اپنے حالات و واقعات سے اسے باخبر رکھا جائے، اور اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔

مسئلۂ سُود

جس میں سُود کی تعریف، تجارتی سُود، جاہلیّتِ عرب کا سُود اور قرآن و سنّت میں اُس کا مفہوم، اس کی حُرمت اور اس پر وعیدِ شدید اور اس کی دینی، دُنیوی اور معاشی تباہ کاری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتیٔ اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی

مسئلہ سُود

جس میں سُود کی تعریف ، تجارتی سُود، جاہلیّتِ عرب کا سُود
اور قرآن وسنّت میں اُس کا مفہوم، اس کی حُرمت اور اس
پر وعیدِ شدید اور اس کی دینی، دُنیوی اور معاشی تباہ کاری پر
سَیر حاصل بحث کی گئی ہے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتیٔ اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴